فہرست مضامین

پیش لفظ

بسم الله نحمده و نصلی علی رسوله الکریم.

مغرب کے غلبہ کے بعد سے غیر اسلامی امور کا دخل ہماری معاشرت، سیاست اور معیشت میں روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اصحاب توفیق ان کا مقابلہ کرنے یا ان کو اسلامی رنگ دینے میں لگے ہیں اور ہمارے لئے ان کے خلوص میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مغربی تسلط کی وجہ سے پیش آمدہ اقتصادی مسائل کے بارے میں سب ہی متفق اللسان ہیں کہ شریعت کی روشنی میں ان کا کوئی حل ہونا چاہئے۔ دارالعلوم کراچی کے جناب مولانا تقی عثمانی مدظلہ جن کو جدید اقتصادیات میں بھی درک حاصل ہے انہوں نے اسلامی بینکنگ اور اسلامی انشورنس سے متعلق صرف نظریاتی حد تک ہی نہیں بلکہ عملی میدان میں بھی خاصی پیش رفت کی ہے اور اب نہ صرف بہت سے اسلامی بینک کھل گئے ہیں بلکہ بہت سی اسلامی انشورنس یا تکافل کمپنیاں وجود میں آ رہی ہیں۔ اسی طرح پبلک کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت، سٹاک ایکسچینج اور کمپنیوں کی محدود ذمہ داری جیسے اہم مسائل بھی ہیں جن کے جواز کے حق میں مولانا تقی عثمانی مدظلہ کا واضح موقف موجود ہے۔

جیسے جیسے مولانا عثمانی مدظلہ کے ان مذکورہ بالا مسائل کے بارے میں موقف اور دلائل سامنے آتے گئے ہم ان پر غور کرتے رہے اور اپنے غور و فکر کا نتیجہ بھی مولانا تقی

عثمانی مدظلہ اور دیگر اہل علم کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔ ہمیں مولانا مدظلہ کی نکتہ رسی کا اعتراف بھی ہے اور ہمیں لحاظ بھی آتا ہے کہ ہم مولانا مدظلہ کی سالہا سال کی محنت کی مخالفت کرتے ہیں اور عملی پیش رفت میں بھی ان سے تعاون نہیں کرتے لیکن بات دین کی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں دیانتداری سے وابستہ رکھیں۔ اب اپنی کاوشوں کو ہم نے نظر ثانی کر کے یکجا شائع کرنا مناسب سمجھا۔ اب بھی امید ہے کہ مولانا مدظلہ اور ان کے رفقاء ہماری معروضات کو درخور اعتناء سمجھیں گے۔ دیگر اہل علم کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ وہ ان مسائل کو شخصیات کے بجائے دلائل سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کریں۔ اور اگر ہماری کوئی غلطی سامنے آئے تو ہمیں سمجھا دیں۔ یہ خیال کر کے بیٹھ رہنا کہ یہ علمی اختلاف ہے اور اس صورت میں کسی بھی قول کو لیا جا سکتا ہے درست نہیں ہے کیونکہ یہ ائمہ مجتہدین کا اختلاف نہیں ہے۔ اور جن فقہی قواعد پر دونوں قولوں کا مدار ہے وہ متفقہ ہیں اور اختلاف صرف اس میں ہے کہ کس کی بات ان قواعد کے موافق ہے اور کس کی مخالف ہے۔

یہاں دارالعلوم کراچی کے نائب مفتی اور استاذ الحدیث مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب یہ مشورہ دیتے نظر آتے ہیں:

> ’’جو حضرات تنقید فرماتے ہیں اور مخلص ہیں تو ان کے لئے زبانی یا تحریری تنقید سے کہیں بہتر صورت یہ ہے کہ وہ عامۃ المسلمین کے لئے سودی بینکنگ کا متبادل شرعی نظام خود عملی طور پر قائم فرمائیں تا کہ ان کے مثالی نمونہ کی پیروی کی جا سکے۔‘‘ (اسلامی بینکاری ایک حقیقت پسندانہ جائزہ ص:7)

ہم کہتے ہیں کہ بینکنگ کے نظام کو عملی طور پر قائم کرنا بہت سی باتوں پر موقوف ہے مثلاً وسائل کا ہونا، اصحاب کار کا ہونا، حکومت کا اس نظام کو من وعن قبول کرنا اور اس

سے پورا پورا تعاون کرنا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہو تو اس صورت میں مولانا محمود اشرف صاحب کا مشورہ **مالا یطاق** کی تجویز بن کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے پاس نہ اتنے وسائل ہیں، نہ اصحاب کار ہیں، نہ اتنا حوصلہ ہے اور نہ حکومت سے منوانے کی توقع ہے۔ غرض ہمارے پاس استطاعت ہی صرف اتنی ہے کہ ہم دیگر اہل علم کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے اصحاب علم کی خدمت میں اپنی گزارشات پیش کر دیں۔ اور وہ اپنے علم، اپنے حوصلہ، وسائل اور قوت تاثیر کی بدولت ان پر عمل کروائیں۔ ہم اپنے دارالافتاء کے ساتھیوں خصوصا مفتی رفیق صاحب سلمہ کے اور تخصص میں شریک طلبہ کے مشکور ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ غور و فکر میں شریک رہے اور ہماری معاونت کرتے رہے۔ **و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.**

عبدالواحد　　　　　　　　شعبان 1429ھ

دارالافتاء۔ جامعہ مدنیہ راوی روڈ لاہور

دارالافتاء والتحقیق چوبرجی پارک لاہور

مسئلہ:1

کمپنیوں کی محدود ذمہ داری کی شرعی حیثیت

بسم اللہ حامدا و مصلیا

بادی النظر میں ہی کمپنیوں کی محدود ذمہ داری کا تصور اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ اس میں بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ جناب مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی اس کے جواز کے حق میں لکھی گئی دو قدرے مفصل تحریریں ہمیں پڑھنے کو ملیں۔

1-ایک اردو میں جوان کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں کمپنی پر ایک نظر شرعی حیثیت سے'' کے عنوان سے ص 79 تا ص 83 موجود ہے۔

2- دوسری انگریزی میں جوان کے صاحبزادے مولوی عمران اشرف عثمانی کی کتاب Meezan Bank's guide to Islamic Banking کے صفحات 223 تا 232 پر The Principle of Limited Liability کے عنوان سے ہے۔

اردو تحریر میں تو نہیں البتہ انگریزی تحریر میں مولانا مدظلہ لکھتے ہیں۔

As a humble student of Shariah, this author have been considering the issue

since long, and what is going to be presented in this article should not be treated as a final verdict on this subject, nor an absolute opinion on the point. It is the outcome of initial thinking on the subject, and the purpose of this article is to provide a foundation for further research.

(Meezanbank's guide to Islamic Banking P-224)

(شریعت کے ایک عاجز طالب علم کی حیثیت سے میں بہت عرصہ سے اس مسئلہ پر غور کرتا رہا ہوں اور اس مضمون میں جو خیال پیش کیا جا رہا ہے اس کو اس موضوع پر فیصلہ کن بات نہ سمجھی جائے۔ یہ ایک ابتدائی غور وفکر کا نتیجہ ہے اور اس کا اصل مقصد مزید تحقیق کیلئے بنیاد فراہم کرنا ہے)۔

ہمیں مولانا مدظلہ کے مؤقف سے اتفاق نہیں ہوا۔

کمپنی کی محدود ذمہ داری کا تعارف

خود مولانا مدظلہ اس کا تعارف یوں کراتے ہیں۔

The limited liability in the modern economic and legal terminology is a condition under which a partner or a shareholder of a business secures

himself from bearing a loss greater than the amount he has invested in a company or partnership with limited liability. If the business incurs a loss, the maximum a shareholder can suffer is that he may lose his entire original investment. But the loss cannot extend to his personal assets, and if the assets of the company are not sufficient to discharge all its liabilities, the creditors cannot claim the remaining part of their receivables from the personal assets of the shareholders.

Rather, it will be truer, perhaps, to say that the concept of 'limited liability' originally emerged with the emergence of the corporate bodies and joint stock companies. The basic purpose of the introduction of this principle was to attract the maximum number of investors to the large-scale joint ventures and to assure

them that their personal fortunes will not be at stake if they wish to invest their savings in such a joint enterprise. In the practice of modern trade, the concept proved itself to be a vital force to mobilize large amounts of capital from a wide range of investors.

The question of 'limited liability' it can be said, is closely related to the concept of juridical personality of the modern corporate bodies. According to this concept, a joint-stock company in itself enjoys the status of a separate entity as distinguished from the individual entities of its shareholders. The separate entity as a fictive person has legal personality and may thus sue and be sued, may make contracts, may hold property in its name, and has the legal status of a natural person in all its transactions entered into the capacity of a juridical

person.

The basic question, it is believed, is whether the concept of a 'juridical person' is acceptable in shariah or not. Once the concept of 'juridical person' is accepted and it is admitted that, despite its fictive nature, a juridical person can be treated as a natural person in respect of the legal consequences of the transactions made in its name, we will have to accept the concept of 'limited liability' which will follow as a logical result of the former concept. The reason is obvious. If a real person i.e. a human being dies insolvent, his creditors have no claim except to the extent of the assets he has left behind. If his liabilites exceed his assets, the creditors will certainly suffer, no remedy being left for them after the death of the indebted person.

Now, if we accept that a company, in

its capacity of a juridical person, has the rights and obligations similar to those of a natural person, the same principle will apply to an insolvent company. A company, after becoming insolvent, is bound to be liquidated: and the liquidation of a company corresponds to the death of a person, because a company after its liquidation cannot exist any more. If the creditors of a real person can suffer, when he dies insolvent, the creditors of a juridical person may suffer too, when its legal life comes to an end by its liquidation.

Meezanbank's guide to Islamic Banking pp 223-225

ترجمہ: جدید قانون اور جدید اقتصادیات کی اصطلاح میں limited liability یعنی محدود ذمہ داری سے وہ حالت مراد ہے جس میں کاروبار کا شریک یا حامل حصص کمپنی یا شراکت میں اپنے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ نقصان سے اپنی کو بری رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو وہ اس کاروبار میں لگائے ہوئے اپنے سرمایہ کی حد

تک تو نقصان برداشت کرے گا، اس سے زیادہ نہیں۔ اور اگر کمپنی کے اثاثہ جات اس پر واجب الاداء قرضوں کی ادائیگی کے لئے پورے نہ ہوں تو دائنین اور قرض خواہ اپنے باقی ماندہ قرضوں کی واپسی کا مطالبہ حاملین حصص کے دیگر ذاتی اثاثہ جات میں سے نہیں کر سکتے۔

...... یہ کہنا شاید زیادہ درست ہوگا کہ محدود ذمہ داری کا تصور ابتداء کارپوریٹ اداروں اور جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کے وجود میں آنے سے ابھرا۔

محدود ذمہ داری کے ضابطہ کو اختیار کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بڑے مشترکہ کاروباری منصوبوں میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاروں کو راغب کیا جائے اور انہیں اطمینان دلایا جائے کہ نقصان کی صورت میں ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کے علاوہ ان کے دیگر ذاتی اثاثہ جات پر زد نہ پڑے گی۔ موجودہ تجارت کے رواج میں محدود ذمہ داری کا تصور بہت سے سرمایہ کو متحرک کرنے کا باعث بنا ہے۔

....

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ محدود ذمہ داری کے مسئلہ کا موجودہ مشترکہ کاروباری اداروں کی قانونی شخصیت سے گہرا تعلق ہے۔ محدود ذمہ داری کے تصور کے مطابق ایک مشترکہ سٹاک کمپنی ایک علیحدہ مستقل شخصیت رکھتی ہے جو حاملین حصص کی انفرادی شخصیتوں سے جداگانہ حیثیت کی حامل ہے۔ یہ جداگانہ شخصیت اگرچہ فرضی ہے لیکن اس کو قانونی اعتبار حاصل ہے اور اس وجہ سے وہ خود مدعی اور مدعا علیہ بننے، معاملات کرنے اور اپنے نام جائیداد کی ملکیت رکھنے کی اہلیت کی حامل

ہے اور لین دین کے اپنے تمام معاملات میں اس کو حقیقی شخص کی سی قانونی حیثیت حاصل ہے۔ گویا حقیقی شخص کے مقابلے میں یہ معنوی یا قانونی شخص ہے۔

اب بنیادی سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا قانونی شخص کا تصور شریعت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ جب اس کو تسلیم کرلیا جائے کہ قانونی شخص کو باوجود معنوی ہونے کے حقیقی شخص کی طرح اعتبار کیا جاسکتا ہے تو اس کے منطقی نتیجہ کے طور پر محدود ذمہ داری کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کی وجہ واضح ہے کیونکہ اگر کوئی حقیقی انسان مفلس ہوکر مرجاتا ہے تو اس کے قرض خواہوں اور دائنین کی رسائی صرف اس کے اثاثوں تک رہتی ہے جو وہ چھوڑ کر مرا۔ اگر اس پر قرضے اس کے اثاثوں سے زائد ہوں تو زائد قرض سے ان کو محروم ہونا پڑے گا اور اس کا کوئی مداوا نہ ہوگا۔ اور اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ قانونی شخص کی حیثیت سے کمپنی ان ہی حقوق و ذمہ داریوں کی حامل ہے جو حقیقی شخص رکھتا ہے تو یہی ضابطہ مفلس و دیوالیہ کمپنی پر بھی لاگو ہوگا۔ مفلس ہونے کے بعد کمپنی کی لامحالہ تحلیل ہو گی اور کسی کمپنی کا تحلیل ہونا ایسے ہی ہے جیسے ایک حقیقی شخص کا مرجانا کیونکہ تحلیل ہونے کے بعد کمپنی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اگر حقیقی شخص کے قرض خواہ اس کی مفلسی میں موت کی وجہ سے محروم ہوسکتے ہیں تو قانونی شخص کی تحلیل سے ختم ہونے پر اس کے قرض خواہ اور دائنین بھی محروم ہوسکتے ہیں۔

کیا جوائنٹ سٹاک کمپنی شرعاً قانونی شخص ہے

مولانا تقی عثمانی مدظلہ جوائنٹ سٹاک کمپنی کو قانونی شخص قرار دیتے ہیں اور انہوں نے فقہ اسلامی سے بیت المال اور وقف کی صورت میں اس کے نظائر تو پیش کئے ہیں لیکن شرعی اعتبار سے کمپنی صرف قانونی شخص ہی بن سکتی ہے، حقیقی شخص نہیں اس کے لئے انہوں نے کوئی شرعی دلیل نہیں دی۔ یاد رہے کہ جب وہ قانونی شخص کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو قانون سے ان کی مراد ملکی غیر شرعی قانون ہے۔ مطلق شخص اور قانونی شخص کے بارے میں ہم پہلے ملکی قانون کے مطابق کچھ تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

سامنڈ (Salmond) نے شخص کی تعریف یوں کی ہے۔

A person is any being to whom the law attributes a capability of interests and therefore of rights, of acts and there fore of duties. (Jurisprudence by M. Farani p.118)

شخص ہر وہ ہستی ہے جس کو قانونی مفادات و اعمال کی صلاحیت سے اور نتیجہ میں حقوق اور ذمہ داریوں سے متصف قرار دیتا ہے۔

گرے (Gray) نے بھی شخص کی ایسی ہی تعریف کی ہے۔

An entity to which rights and duties may be attributed.

وہ ہستی جس کو حقوق و ذمہ داریوں سے متصف قرار دیا جا سکتا ہے۔

اور کیٹن (Keeton) آگے وضاحت کرتے ہیں۔

In law, we are concerned with legal persons, whether they are natual i.e., human beings capable of

sustaining rights and duties or artificial or juristic i.e. groups or things to which law attributes the capacity of bearing rights and duties. (Jurisprudence by M. Farani p.118)

قانون میں ہماری بات قانونی اشخاص کی ہوتی ہے خواہ

i- وہ حقیقی ہوں یعنی انسان ہوں جو حقوق و ذمہ داریوں کا تحمل کر سکتے ہوں یا

ii- وہ فرضی یا قانونی ہوں یعنی گروپ (مجموعے) یا اشیاء ہوں جن کو قانون حقوق و ذمہ داریوں کے تحمل کی قابلیت سے متصف قرار دیتا ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کی روشنی میں معلوم ہوا کہ:

1- قانونی شخص قانون کی مصنوعی اور اختراعی ایجاد ہے۔

Legal personality is therefore an artificial creation of law. (Jurisprudence by M. Farani p.119)

2- قانون جس ہستی اور جس شے کو چاہے شخص قرار دے سکتا ہے۔

so a legal system may pesonify whatever beings or objects it pleases. (Jurisprudence by M. Farani p.118)

قانونی شخصیت کے اختراع کی وجہ

But legal personality remains, in essence, merely a convenient juristic device by which the problem of organising rights and duties is carried out. (Jurisprudence by M. Farani p.120)

حاصل یہ ہے کہ قانونی شخصیت ایک آسان قانونی ذریعہ ہے جس سے حقوق و ذمہ داریوں کے انتظام کے مسئلہ کو حل کیا جاتا ہے۔

ملکی قانون کی نظر میں جوائنٹ سٹاک (مشترکہ سرمایہ کاری کی) کمپنی قانونی شخص ہے

A group of persons, such as a Joint Stock Company or a Corporation aggregate may be regarded as a person in law Here although the company consists of human beings it is the company as such, distinct from the human beings that comprise the company, that is regarded as a pesron in law and invested with rights and duties. (Jurisprudence by M. Farani p.119)

افراد کے مجموعہ مثلاً جوائنٹ سٹاک کمپنی یا کارپوریشن کو قانون میں شخص کہا جا سکتا ہے۔ کمپنی اگرچہ چند انسانوں پر مشتمل ہے لیکن ان سے قطع نظر کر کے صرف کمپنی کو قانون میں شخص قرار دیا گیا ہے اور حقوق و ذمہ داریوں کو اس سے وابستہ کیا گیا ہے۔

کمپنی اور شرکت میں فرق

شرکت اور کمپنی میں بعض فرق ہیں جو مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے الفاظ میں یہ ہیں:

1- شرکت میں ہر شخص کاروبار کے تمام اثاثوں کا مشاع طور پر مالک ہوتا ہے۔ ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے۔ ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے مثلاً کوئی دین واجب ہوا تو تمام شرکاء سے

برابر درجے میں مسئولیت ہوگی مگر کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔

2- شرکت میں کوئی شریک شرکت فسخ کر کے اپنا سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے مگر کمپنی میں سے اپنا سرمایہ نہیں نکالا جا سکتا البتہ حصص فروخت کیے جا سکتے ہیں۔

3- شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، کمپنی کا الگ سے قانونی وجود ہوتا ہے جس کو شخص قانونی کہتے ہیں۔

4- شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی جبکہ کمپنی کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔(اسلام اور جدید معیشت و تجارت ص61, 62)

کمپنی کی ذمہ داری کا کیا سبب ہے

اس کا سبب جو خود مولانا تقی عثمانی صاحب نے بتایا وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے

The basic purpose of the introduction of this principle was to attract the maximum number of investors to the large-scale joint ventures and to assure them that their personal fortunes will not be at stake if they wish to invest their savings in such joint enterprise.

محدود ذمہ داری کے ضابطہ کو اختیار کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بڑے مشترکہ

کاروباری منصوبوں میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کو راغب کیا جائے اور انہیں اطمینان دلایا جائے کہ نقصان کی صورت میں ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کے علاوہ ان کے دیگر ذاتی اثاثہ جات پر زد نہ پڑے گی۔

لیکن مولانا عثمانی صاحب کو خود اعتراف ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصور دائنین اور قرض دہندگان کے لئے مضر ہے

مولانا تقی عثمانی مدظلہ خود لکھتے ہیں۔

No doubt, the concept of 'limited liability' is beneficial to the share holders of the company. but at the same time, it may be injurious to the creditors. If the liabilities of a limited company exceed its assets, the company becomes insolvent and is consequently liquidated, the creditors may lose a considerable amount of their claims, because they can only receive the liquidated value of the assets of the company, and have no recourse to its share-holders for the rest of their claims, Even the directors of the company who may be responsible for

such an unfortunate situation cannot be held responsible for satisfying the claims of the creditors.

اس میں کوئی شک نہیں کہ محدود ذمہ داری کا تصور کمپنی کے حاملین حصص کے لئے مفید ہے لیکن ساتھ ہی یہ دائنین کیلئے مضر ہے کیونکہ اگر محدود کمپنی کے دیون وقرضہ جات اس کے اثاثوں سے تجاوز کر جائیں تو کمپنی دیوالیہ ہوکر تحلیل ہو جاتی ہے اور دائنین وقرض دہندگان اپنے دیون اورقرضوں کی بڑی مقدار سے محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ صرف کمپنی کے تحلیل شدہ اثاثہ جات میں سے اپنے دیون اورقرض وصول کر سکتے ہیں اور باقی مقدار کے لئے ان کو حاملین حصص تک کوئی رسائی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کمپنی کے ڈائریکٹران کوبھی جوکہ خسارہ کے اصل ذمہ دار ہیں دیون اورقرضوں کی پوری ادائیگی کا ذمہ دارنہیں بنایا جاسکتا۔

اہم تنبیہ

مولانا تقی عثمانی صاحب نے اپنی کتاب اسلام اور جدید معیشت وتجارت میں شرکت اور کمپنی کے درمیان جوفرق بیان کئے ہیں وہ اوپر گزر چکے ہیں۔ان سے واضح ہے کہ کمپنی کا کاروبار شرکت سے مختلف ہے۔ایک اوراختلاف کا ہم اضافہ کرتے ہیں جو یہ ہے کہ شرکت میں شریک حضرات میں صرف نفع تقسیم ہوتا ہے وہ تنخواہ نہیں لے سکتے جبکہ کمپنی کے ڈائریکٹران تنخواہ اور بھتے بھی وصول کرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود مولانا تقی عثمانی اور ان کے صاحبزادے مولوی عمران اشرف عثمانی کمپنی کی حقیقت کے بارے میں عجیب تذبذب کا شکار ہیں۔لیکن اس کو

جاننے سے پہلے مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب اسلام اور جدید معیشت وتجارت کا اقتباس پڑھیئے۔

"......کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں۔ فقہاء نے شرکت کی چار قسمیں ذکر کی ہیں۔ اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے تو پانچ قسمیں بن جاتی ہیں۔ کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں جیسا کہ پہلے شرکت اور کمپنی میں فرق بتائے جاچکے ہیں۔

اب یہاں علمائے معاصرین کے تین نقطہ نظر ہیں۔

ایک یہ کہ شرعاً شرکت ان پانچ قسموں میں منحصر ہے اور کمپنی ان میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ......فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر کی ہیں وہ منصوص نہیں، بلکہ فقہاء نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کرکے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے......لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطہ نظر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ اپنی حقیقی روح کے اعتبار سے کمپنی شرکت عنان میں داخل ہے (امداد الفتاویٰ ص 37,464) اگرچہ کمپنی کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو معروف شرکت عنان میں نہیں پائی جاتیں لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ (ص 79)

ہم کہتے ہیں

مولانا عثمانی صاحب کی یہ عبارت عجیب سی ہے۔ کمپنی اور شرکت کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے شرکت کو مطلق ذکر کیا جس کا مطلب ہوا کہ شرکت عقد کی جمیع صورتیں اس میں داخل ہیں خواہ وہ معروف چار ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور غیر معروف ہو اور کمپنی ان سب سے جدا ہے۔ پھر مولانا نے کمپنی کو شرکت کی (ایک اور) قسم بنالیا اور پھر مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی عبارت کی روشنی میں یہ بتا دیا کہ اس میں عنان کی حقیقت بھی باقی ہے۔

غرض کمپنی سے پہلے شرکت کی مطلقاً نفی کی پھر اس نفی کی نفی کرتے ہوئے اس کو درجہ بدرجہ شرکت عنان میں داخل کر دیا اور ان کے صاحبزادے مولوی عمران اشرف عثمانی صاحب نے تو اس کے شرکت عنان ہونے کی کھلی کھلی تصریح کر دی۔

As mentioned in the books and research papers of Islamic jurists, companies come under the ruling of Shirkat-ul-Ainan. (Meezan bank's guide to Islamic Banking)

(جیسا کہ فقہائے اسلام کی کتابوں اور تحقیقی مقالوں میں مذکور ہے کمپنیاں شرکت عنان کے تحت آتی ہیں)۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی یہ عبارت بھی ان کے تذبذب کی وجہ سے ہے۔

''......اسی طرح کمپنی ابتداء لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ تم اس کاروبار میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ لہٰذا جو شخص اس وقت

میں شیئر حاصل کر رہا ہے وہ گویا کہ شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔'' (شیئرز کی خرید وفروخت ص 8)

کیونکہ یہ کہنے کے بعد کہ ''تم اس کاروبار میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ'' اس کہنے کا کیا مطلب ہوا کہ ''وہ گویا کہ شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔'' مولانا کو تو یوں کہنا چاہئے تھا کہ ''وہ درحقیقت شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔''

ہم کہتے ہیں کہ اگر مولانا تقی عثمانی صاحب ہماری تجویز سے اتفاق کریں تو وہ اپنے تذبذب سے نکل سکتے ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ یہ اولاً شرکت املاک ہے اور پھر عقد اجارہ ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حصص کے خریدار اور ابتدائی سرمایہ کار اپنے مال ملا کر اکٹھا کر لیتے ہیں اور یوں ان کے مال میں شرکت قائم ہو جاتی ہے۔ پھر ڈائریکٹرز کا چناؤ کیا جاتا ہے جو اجرت اور بھتوں کے عوض میں اس مشترکہ سرمایہ پر کام کرتے ہیں اور نفع کو ہر ایک کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ شرکت املاک ہے اور پھر شرکت عقد نہیں ہے اجارہ ہے۔

لیکن دارالعلوم کراچی کے ایک فتوے مورخہ 19 ربیع الثانی 1425ھ نے جس پر مولانا تقی عثمانی صاحب کے بھی دستخط ہیں ہماری تجویز کو رد کرتے ہوئے لکھا۔

''کمپنی کے وجود میں آنے کیلئے ''عقد اجارہ'' ضروری نہیں ہے بلکہ اصلاً یہ ایک ''عقد مشارکہ'' ہے''

شاید اب مولانا تقی عثمانی، مولوی عمران اشرف عثمانی اور دیگر ارباب دارالعلوم ہماری تجویز پر دوبارہ غور کریں۔

اب ہم دوبارہ اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔

کمپنی کے کام کی جو بھی حقیقت ہو اس کی اصل یہ تین بنیادیں ہیں

1- کمپنی کے ڈائرکٹران کے کام میں سال بھر تک کسی دوسرے کی طرف سے مداخلت نہ ہو۔

2- ڈائرکٹران کو کام کیلئے جو مشترکہ سرمایہ حاصل ہوا ہے اس میں کمی نہ ہو۔

3- کمپنی کے ڈائریکٹران اور دیگر حاملین حصص کی ذمہ داری محدود ہو۔

کمپنی کو شخص قانونی بنانے کی وجہ

ان تین بنیادوں کو بعینہ اسی طرح لیں تو پہلی دو بنیادوں پر حقوق و ذمہ داریاں ڈائرکٹران اور حاملین حصص سے وابستہ ہوتی ہیں جو حقیقی اشخاص ہیں اور تیسری بنیاد شرط فاسد ہونے کی وجہ سے لغو قرار پاتی ہے۔

لیکن یہ بات سرمایہ دارانہ ذہنیت کو قبول نہیں اس لئے اس نے ان بنیادوں کو دوسری طرح سے تعبیر کیا۔

1- کمپنی کے کام میں سال بھر تک کسی دوسرے کی طرف سے مداخلت نہ ہو۔

2- کمپنی کو جو مشترکہ سرمایہ حاصل ہوا ہے اس میں کمی نہ ہو۔

3- کمپنی کی ذمہ داری محدود ہو۔

اور کمپنی چونکہ ایک فرضی اور معنوی چیز ہے حسی اور حقیقی نہیں اس لئے اس کو ارباب قانون سے شخص قانونی کہلوایا اور یوں اپنا مقصد حاصل کیا اور یہ بات پوری ہوئی کہ

But legal personality remains, in essence, merely a convenient and juristic device by which the problem of organising right and duties is carried out.

(Jurisprudence by M. Farani p.120)

حاصل یہ ہے کہ قانونی شخصیت ایک آسان قانونی ذریعہ ہے جس سے حقوق و ذمہ داریوں کے انتظام کے مسئلہ کو (حسب منشا......ناقل) حل کیا جا سکتا ہے۔

کمپنی کیلئے قانونی شخصیت اور محدود ذمہ داری ہونے پر مولانا تقی عثمانی کا استدلال

مولانا تقی عثمانی صاحب نے کمپنی کے شخص قانونی ہونے کو بھی اور اس کی ذمہ داری کے محدود ہونے کو بھی شرعا جائز خیال کیا ہے۔ خود مولانا ان دو باتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''البتہ کمپنی میں دو چیزیں شرعی اعتبار سے خاص طور پر قابل غور اور باعث تردد ہیں۔ ان امور کے بارے میں احقر اپنی اب تک کی سوچ کا حاصل اہل علم کے غور وفکر کے لئے پیش کرتا ہے۔

1- پہلا مسئلہ یہ ہے کہ...... کمپنی کا اپنا مستقل قانونی وجود ہوتا ہے جس کو شخص قانونی کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شخص قانونی کا تصور شرعا درست ہے یا نہیں؟ جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں گو شخص قانونی کی اصطلاح موجود نہیں لیکن اس کے نظائر موجود ہیں (اسلام اور جدید معیشت تجارت)

مولانا تقی عثمانی صاحب کے پیش کردہ چند نظائر

1. Waqf

The first precedent is that of a waqf. A waqf is a legal and religious institution

wherein a person dedicates some of his properties for a religious or a charitable purpose. The properties, after being declared as Waqf, no longer remain in the ownership of the donor. The beneficiaries of a Waqf can benefit from the corpus or the proceeds of the dedicated property, but they are not its owners. Its ownership vests in Allah Almighty alone.

It seems that the Muslim jurists have treated the Waqf as a separate legal entity and have ascribed to it some characteristics similar to those of a natural person. This will be clear from two rulings given by the fuqaha (Muslim jurists) in respect of Waqf.

Firstly, if a property is purchased with the income of a Waqf, the purchased property cannot become a part of the Waqf automatically. Rather, the jurists

say, the property so purchased shall be treated, as a property owned by the Waqf. It clearly means that a Waqf, like a natural person, can own a property.

Secondly. the jurists have clearly mentioned that the money given to a mosque as donation does not form part of the Waqf, but it passes to the ownership of the mosque.

Here again the mosque is accepted to be an owner of money. Some jurists of the Maliki School have expressly mentioned this principle also. They have stated that a mosque is capable of being the owner of something. This capability of the mosque, according to them, is constructive, while the capability enjoyed by a human being is physical.

Another renowned Maliki jurist, namely, Ahmad Al-Dardir, validates a bequest made in favour of a mosque,

and gives the reason that a mosque can own properties. Not only this, he extends the principle to an inn and a bridge also, provided that they are Waqf.

It is clear from these examples that the Muslim jurists have accepted that a Waqf can own properties. Obviously, a Waqf is not a human being, yet thay have treated it as a human being in the matter of ownership. Once its ownership is established, it will logically follow that it can sell and purchase, may become a debtor and a creditor and can sue and be sued, and thus all the characteristics of a 'juridical person' can be attributed to it.

2. Baitul-Mal

Another example of 'juridical person' found in our classic literature of Fiqh is that of the Baitul-mal (the exchequer of an Islamic state). Being public property, all the citizens of an Islamic state have some beneficial right over the Baitul-mal,

yet, nobody can claim to be its owner. Still, the Baitul-mal has some rights and obligations. Imam Al-Sarakhsi, the well-known Hanafi jurist, says in his work "Al-Mabsut": "The Baitul-mal has some rights and obligations, which may possibly be undetermined."

At another place the same author says: "If the head of an Islamic state needs money to give salaries to his army, but he finds no money in the Kharaj department of the Baitul-mal (wherefrom the salaries are generally given) he can give salaries from the sadaqah (Zakah) department, but the amount so taken from the sadaqah department shall be deemed to be a debt on the Kharaj department."

It follows from this that not only the Baitul-mal, but aslo the different departments therein can borrow and

advance loans to each other. The liability of these loans does not lie on the head of state, but on the concerned department of Baitul-mal. It means that each department of Baitul-mal is a separate entity and in that capacity it can advance and borrow money, may be treated a debtor or a creditor, and thus can sue and be sued in the same manner as a juridical person does. It means that the Fuqaha of Islam have accepted the concept of Juridical person in respect of Baitul-mal.

1- وقف

یہ ایک قانونی اور مذہبی ادارہ ہے جس میں ایک شخص اشاعت دین یا خیرات کی غرض سے اپنی جائیداد مختص کرتا ہے۔ وقف ہونے کے بعد جائیداد وقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور جن پر وقف ہو وہ بھی مالک نہیں بنتے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ اس کے مالک بنتے ہیں۔

مسلم فقہاء نے وقف کو علیحدہ قانونی شخصیت قرار دیا ہے اور اس کے لئے کچھ وہ اوصاف ذکر کئے ہیں جو حقیقی شخص کے ہوتے ہیں۔ یہ بات مندرجہ ذیل دو احکام سے واضح ہوتی ہے:

i- اگر وقف کی آمدنی سے کوئی جائیداد خریدی جائے تو خریدی ہوئی جائیداد خود بخود وقف کا حصہ نہیں بن جاتی بلکہ وہ وقف کی مملوک کہلاتی ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حقیقی شخص کی طرح وقف بھی جائیداد کا مالک بن سکتا ہے۔

ii- مسجد کو جو رقم چندہ کی گئی وہ وقف کا حصہ نہیں بنتی بلکہ مسجد کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی مسجد کو رقم کا مالک تسلیم کیا گیا ہے۔

بعض مالکی فقہاء نے اس بات کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ مسجد کسی چیز کا مالک بننے کی اہلیت رکھتی ہے اگر چہ مسجد کی یہ اہلیت معنوی ہے جبکہ انسان کی اہلیت حسی ہوتی ہے۔ مشہور مالکی فقیہ احمد دردیر کہتے ہیں کہ مسجد کیلئے کی گئی وصیت جائز ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسجد جائیداد کی مالک بن سکتی ہے۔ وہ یہی حکم سرائے اور پل کیلئے بھی مانتے ہیں۔

غرض وقف اگر چہ آدمی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود فقہاء ملکیت کے اعتبار سے اس کو آدمی کی طرح دیکھتے ہیں۔ اور جب وقف کیلئے ملکیت ثابت ہوئی تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خرید و فروخت بھی کر سکتا ہے اور مقروض بھی ہو سکتا ہے اور قرض دہندہ بھی اور مدعی بھی بن سکتا ہے اور مدعا علیہ بھی۔ غرض قانونی شخص کے تمام خواص کو وقف کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

2- بیت المال

عامتہ الناس کی جائیداد ہونے کی وجہ سے اگر چہ اسلامی ریاست کے تمام افراد بیت المال پر منفعتی حق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی اس کا مالک نہیں ہوتا۔ پھر بھی بیت المال کے کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ مبسوط میں لکھتے ہیں کہ ''بیت المال کے کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں جو متعین نہیں ہیں'' ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں ''اگر اسلامی ریاست کے امیر کو فوج کی تنخواہیں دینے کیلئے رقم کی ضرورت ہو اور خراج والے حصہ میں رقم نہ ہو تو وہ صدقہ و زکوٰۃ والے حصہ سے لے کر دے سکتا ہے لیکن یہ خراج والے حصہ پر قرض شمار ہوگا۔''

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ صرف بیت المال بلکہ اس کے ذیلی شعبے تک قرض کا لین دین کر سکتے ہیں۔ ان قرضوں کی ذمہ داری ریاست کے امیر پر نہیں آتی بلکہ بیت المال کے متعلقہ شعبہ پر آتی ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ بیت المال کا ہر شعبہ ایک مستقل شخصیت ہے اور اپنی اس حیثیت سے وہ قانونی شخص کی طرح قرض کا لین دین بھی کر سکتا ہے اور مدعی اور مدعا علیہ بھی بن سکتا ہے۔ غرض فقہائے اسلام بیت المال کے قانونی شخص ہونے کو تسلیم کرتے ہیں)

''ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص قانونی کا تصور فی نفسہ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے۔ البتہ اصطلاح ضرور نئی ہے۔''

2- ''کمپنی کی دوسری خصوصیت جو شرعی اعتبار سے قابل غور ہے

وہ......محدود ذمہ داری ہے" (اسلام اور جدید معیشت وتجارت)

پھر مولانا نے اس کے کچھ نظائر ذکر کیئے اور لکھا:

"لیکن اس مسئلہ کو اگر ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد دراصل شخص قانونی کے تصور پر ہے۔ شخص قانونی کی حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا۔" (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص 82)

Once the concept of juridical person is accepted and it is admitted that, despite its fictive nature, a juridical person can be treated as a natural person in respect of the legal consequences of the transactions made in its name, we will have to accept the concept of limited liability which will follow as a logical result of the former concept. (Meezanbank's guide to Islamic Banking p.225).

اب بنیادی سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا قانونی شخص کا تصور شریعت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ جب اس کو تسلیم کرلیا جائے کہ شخص قانونی کو باوجود فرضی ہونے کے مالی معاملات میں شخص حقیقی کی طرح اعتبار کیا جاسکتا ہے تو اس کے منطقی نتیجہ کے طور پر محدود ذمہ داری کو بھی

تسلیم کرنا پڑے گا)۔

غرض مولانا عثمانی مدظلہ کے استدلال کا حاصل یہ ہے کہ شخص قانونی کے نظائر اسلام میں موجود ہیں اس لئے کمپنی کو شخص قانونی ماننا خلاف اسلام نہیں اور شخص قانونی کو تسلیم کرنے کو یہ لازم ہے کہ اس کی ذمہ داری محدود تسلیم کی جائے۔

اوپر ہم کمپنی کے شخص قانونی ہونے کی حقیقت بتا چکے ہیں جس سے یہ بھی واضح ہوا کہ غیر شرعی قانون جہاں چاہتا ہے شخص حقیقی کو یکسر نظر انداز کر کے فرضی شخصیت کا اعتبار کرنے لگتا ہے۔ غرض شخص قانونی کے وجود وعدم میں مدار ملکی غیر شرعی قانون کے اعتبار کرنے نہ کرنے کا ہے۔ لیکن مولانا عثمانی مدظلہ نے اس بات سے کچھ تعرض نہیں کیا کہ شریعت کی رو سے شخص قانونی کے وجود وعدم وجود کا مدار کس پر ہے؟

شخص قانونی کے وجود وعدم کا شرعی معیار

مولانا عثمانی کے بتائے ہوئے وقف و بیت المال کے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم شریعت کی رو سے شخص قانونی کے وجود وعدم وجود کا مدار بتاتے ہیں۔

وقف اور بیت المال کے ساتھ کچھ حقوق اور ذمہ داریاں وابستہ ہوتی ہیں لیکن وہ محض معنوی یا بے جان ہونے کی وجہ سے نہ خود اپنے حقوق کی تحصیل کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے ایک متولی یا نگران مقرر کیا جاتا ہے جو ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ ان اداروں کے اثاثہ جات سے چونکہ اس متولی کا کوئی مالکانہ تعلق نہیں ہوتا اس لئے حقوق و ذمہ داریوں کو اس سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے مجبوراً ادارہ ہی کی طرف ان کو منسوب کیا جاتا ہے اور اس لئے ادارہ کو معنوی شخص یا قانونی شخص کہا جاتا ہے۔

اور جہاں کوئی ادارہ ایسا ہو کہ اس کے متولی و منتظم کی سرمایہ کاری اور اس کے

مفادات اس ادارے سے وابستہ ہوں اور اس کے تصرفات کا فائدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ خود اسی کو ہو تو حقوق و ذمہ داریاں خود اسی کے ساتھ وابستہ ہوں گی۔ اس صورت میں ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ ہم ان حقیقی اشخاص کو نظر انداز کر کے ادارے کی فرضی شخصیت کا اعتبار کریں اور حقوق و ذمہ داریوں کو اس کے ساتھ وابستہ کریں۔ لہٰذا حقوق و ذمہ داریوں کی نسبت لامحالہ حقیقی شخص کی طرف ہو گی۔

کمپنی کی حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کے ڈائریکٹر اپنے سرمایہ پر بھی کام کرتے ہیں اور دیگر حاملین حصص کے سرمایہ پر بھی، اور شرکت املاک کے بعد ان کے اجیر بن کر ان سے اجرت وصول کرتے ہیں۔ مولانا عثمانی مدظلہ اس کو اجارہ کے بجائے شرکت عنان کا معاملہ کہتے ہیں اور ڈائریکٹران کو ورکنگ پارٹنر یعنی عمیل اور دیگر حاملین حصص کو سلیپنگ پارٹنر یعنی غیر عمیل مانتے ہیں۔ غرض معاملہ خواہ اجارہ کا ہو یا شرکت عنان کا بہرحال ڈائریکٹران کمپنی کے کاروبار میں اپنی طرف سے اصیل اور دیگر حاملین حصص کی طرف سے وکیل بن کر تصرف کرتے ہیں۔ کاروبار کا سرمایہ بھی ان ہی کا ہوتا ہے اوران کے تصرفات کا فائدہ بھی ان ہی کو بالواسطہ اور بلاواسطہ ہوتا ہے اور **العبرة للمعانی لا للالفاظ** یعنی اعتبار الفاظ کا نہیں معنی کا ہوتا ہے اس لئے کمپنی کو کوئی لاکھ معنوی شخصیت کہتا رہے لیکن اس کی معنوی شخصیت کالعدم ہے اور حقیقی اشخاص ہی کا اعتبار ہو گا یعنی ڈائرکٹران کا اصل ہو کر اور دیگر حاملین حصص کا ان کے مؤکل ہو کر۔

کمپنی کے ڈائرکٹران اور حاملین حصص کمپنی کے تمام دیون وقرضوں کے ذمہ دار ہوں گے

جب یہ ثابت ہو گیا کہ مشترکہ سٹاک کمپنی کی معنوی شخصیت کا اعتبار نہیں ہے بلکہ حقیقی اشخاص یعنی ڈائریکٹران اور حاملین حصص کا اعتبار ہے اور حقوق و ذمہ

داریوں کا تعلق بھی ان کے ساتھ ہے تو لازم آئے گا کہ دیون اور قرضے خواہ کتنے ہی ہوں وہ سب ان کے ذمہ دار ہوں گے۔

1- مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے بیان کردہ محدود ذمہ داری کے فقہی نظائر اور ان کا جواب

پہلی نظیر: مالک کی طرف سے تجارت کی اجازت پانے والا غلام

مولانا لکھتے ہیں۔

''فقہ میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دلچسپ نظیر موجود ہے جو لمیٹڈ کمپنی سے بہت ہی قریب ہے۔ وہ عبد ماذون فی التجارۃ ہے۔ یہ اپنے آقا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے۔ جو تجارت وہ کرتا ہے وہ بھی مولیٰ (آقا) کی مملوک ہوتی ہے۔ اس پر اگر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوں گے۔ اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہوسکتا ہے اور نہ مولیٰ سے''

(اسلام اور جدید معیشت و تجارت ص 83)

ہم کہتے ہیں کہ مولانا مدظلہ کی یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ:

ماذون غلام اگر زندہ ہو تو صرف اتنا نہیں ہے کہ غلام کو فروخت کیا جائے گا اور اس کی قیمت قرض خواہوں میں تقسیم کر دی جائے گی بلکہ قرض خواہوں کو حق حاصل ہے کہ وہ غلام کو فروخت نہ ہونے دیں اور اس سے کمائی کروا کر اپنے قرضے پورے وصول کریں اور اگر غلام فروخت بھی کر دیا جائے تب بھی قرض خواہوں کو حق حاصل ہے کہ جب کبھی وہ آزاد ہو جائے تو اس سے اپنے قرضوں کی واپسی کا مطالبہ کریں۔

و کل دین وجب علیه بتجارة...... یتعلق برقبته ...... یباع فیه و لهم

استسعاء ہ ایضا (درمختار)

(قوله يباع فيه) ولا يجوز بيعه الا برضى الغرماء او بامر القاضى لان للغرماء حق الاستسعاء ليصل اليهم كمال حقهم (رد المحتار)

ويقسم ثمنه بالحصص...... وطولب الماذون بما بقى من الدين زائدا عن كسبه و ثمنه بعد عتقه لتقرر الدين فى ذمته و عدم وفاء الرقبة (درمختار)

اور ہدایہ میں ہے۔

ديونه متعلقة برقبة يباع للغرماء الا ان يفديه المولى...... والجامع دفع الضرر عن الناس ويقسم ثمنه بينهم بالحصص لتعلق حقهم بالرقبة...... فان فضل شئ من ديونه طولب به بعد الحرية لتقرر الدين فى ذمته و عدم وفاء الرقبة

دوسری نظیر: مفلس مقروض

مولانا لکھتے ہیں۔

''شخص حقیقی مفلس (دیوالیہ) ہو جائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں سے دین کی وصولی کر سکتے ہیں اس سے مزید کا مطالبہ نہیں کر سکتے......البتہ اگر وہ دوبارہ غنی ہو جائے تو اب پھر مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو خراب الذمۃ ہو جاتا ہے، ان کے دیون ادا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔'' (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص 82)

ہم کہتے ہیں کہ مولانا مدظلہ کا یہ کہنا کہ مفلس مقروض سے مزید مطالبہ صرف اس

کے غنی ہونے پر ہی کیا جا سکتا ہے درست نہیں کیونکہ افلاس ثابت ہونے کے بعد قرض خواہ اس کا پیچھا کر سکتا ہے تا کہ وہ جو کچھ کمائے اس میں سے کچھ وصول کرتا رہے۔
ردالمحتار میں ہے قال فی انفع الوسائل، و بعد ما خلی القاضی سبیله فلصاحب الدین ان یلازمه فی الصحیح...... وله ان یلازمه بنفسه و اخوانه و ولده ممن احب (مطلب فی ملازمة المدیون)

اور اگر ماذون غلام اور مفلس مقروض مر بھی جائیں تب بھی آخرت کے اعتبار سے دوسروں کا حق ان کے ذمہ باقی رہتا ہے اور آخرت میں ان کو حساب بیباق کرنا پڑے گا اور مسلمانوں کی معیشت بہرحال آخرت کے مواخذے سے بے پرواہ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تدبیر معاش کی کوئی ایسی صورت تجویز کرنا یا اس کی تصویب کرنا بلکہ اس پر شرعی دلائل کی ڈھال چڑھانے کی کوشش کرنا اسلام کے بالکل خلاف ہے۔

1- عن سلمة بن الاكوع قال كنا جلوسا عند النبی صلی الله علیه وسلم اذ اتی بجنازة فقالوا اصل علیها فقال هل علیه دین قالوا لا فصلی علیها ثم اتی بجنازة اخری فقال هل علیه دین قیل نعم قال فهل ترک شیئا قالوا ثلاثة دنانیر فصلی علیها ثم اتی بالثالثة فقال هل علیه دین قالوا ثلاثة دنانیر قال هل ترک شیئا قالوا لا قال صلوا علی صاحبکم قال ابوقتادة صل علیه یا رسول الله و علی دینه فصلی علیه (بخاری)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ لایا گیا اور لوگوں نے درخواست کی کہ آپ جنازہ پڑھا دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا میت کے ذمہ کچھ قرض ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر ایک

اور جنازہ لایا گیا۔ آپ نے پوچھا کیا اس کے ذمہ قرض ہے۔ کہا گیا کہ جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا اس نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ تین دینار چھوڑے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا اس کے ذمہ قرض ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ اس کے ذمہ تین دینار ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا اس نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے ساتھی کا جنازہ خود پڑھ لو۔ اس پر ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے درخواست کی کہ ان کا قرضہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں آپ جنازہ پڑھا دیجئے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

2- عن ابی قتادة قال رجل یا رسول الله ارایت ان قتلت فی سبیل الله صابرا محتسبا مقبلا غیر مدبر یکفر الله عنی خطایای فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم نعم فلما ادبر ناداه فقال نعم الا الدین کذلک قال جبریل (مسلم)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول اگر میں اللہ کی راہ میں اس طرح قتل کیا جاؤں کہ صبر کرتا ہوں اور ثواب کی امید رکھتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں پیٹھ نہیں پھیرتا تو کیا اللہ میری خطائیں معاف کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں۔ جب وہ شخص واپس مڑا تو آپ نے اسے پکارا اور فرمایا کہ ہاں مگر قرض کو معاف نہ کرے گا۔ اسی طرح جبریل علیہ السلام نے بتایا۔

3- عن عبدالله بن عمرو ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال یغفر للشهید کل ذنب الا الدین (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شہید کے لئے ہر گناہ معاف کر دیا جائے گا سوائے قرض کے۔

4- عن ابی هريرة قال رسول الله صلى الله عليه وسلم نفس المومن معلقة بدينه حتى يقضى عنه (شافعی، احمد و ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کی روح اس پر قرض کی وجہ سے معلق رہتی ہے (اور جنت میں داخل نہیں ہوتی) یہاں تک کہ اس کی طرف سے قرض ادا کر دیا جائے (خواہ بیت المال سے یا میت کے کسی رشتہ دار کی جانب سے یا میت کی نیکیاں دے کر یا قرض خواہوں کی برائیاں اس کے سر ڈال کر)۔

5- عن البراء بن عازب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم صاحب الدين ماسور بدينه يشكو الى ربه الوحدة يوم القيامة (شرح السنة)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرضدار اپنے ذمہ قرض کی وجہ سے قید (تنہائی) میں ہوگا اور قیامت کے دن اپنے رب سے قید تنہائی کی شکایت کرے گا۔

7- عن ابی موسیٰ عن النبی صلى الله عليه وسلم قال ان اعظم الذنوب عند الله ان يلقاه بها عبدا بعد الكبائر التى نهى الله عنها ان يموت رجل و عليه دين لا يدع له قضاء (احمد و ابوداؤد)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ گناہ جن سے اللہ نے منع کیا ہے ان کے بعد اللہ کے نزدیک جو سب سے بڑا گناہ بندہ لے کر اس سے ملے گا یہ ہے کہ وہ اس حال میں مرے کہ اس کے ذمہ

قرض ہو اور اس کی ادائیگی کیلئے کچھ نہ چھوڑا ہو۔

7- **عن محمد بن عبدالله بن جحش قال كنا جلوسا بفناء المسجد...... و رسول الله صلى الله عليه وسلم جالس بين ظهرينا فرفع رسول الله صلى الله بصره قبل السماء فنظر ثم طاطأ بصره و وضع يده على جبهته قال سبحان الله سبحان الله ماذا نزل من التشديد قال فسكتنا يومنا و ليلتنا فلم نرالا خيرا حتى اصبحنا قال محمد فسالت رسول الله صلى الله عليه وسلم ما التشديد الذى نزل قال فى الدين والذى نفس محمد بيده لو ان رجلا قتل فى سبيل الله ثم عاش ثم قتل فى سبيل الله ثم عاش ثم قتل فى سبيل الله ثم عاش و عليه دين مادخل الجنة حتى يقضى دينه (احمد)**

حضرت محمد بن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے......اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور دیکھا۔ پھر آپ نے اپنی نظر جھکالی اور اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھا اور فرمایا سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا ہی سختی نازل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ہم ایک دن رات خاموش رہے لیکن ہم نے سوائے بھلائی کے کچھ (اور مصیبت نازل ہوتے) نہ دیکھی۔ محمد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ وسلم سے پوچھا کہ وہ کیا سختی نازل ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ قرض کے بارے میں تھی۔ اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر کوئی شخص اللہ کے راستے میں قتل کیا جائے پھر زندہ ہو پھر (دوبارہ) اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے پھر زندہ ہو جائے پھر (تیسری مرتبہ) اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے پھر دوبارہ (قیامت کے دن) زندہ ہو اور اس کے ذمہ قرض ہو تو جب تک اس کا قرضہ ادا نہ کیا جائے وہ جنت

میں داخل نہ ہوگا۔

البتہ تین طرح کے لوگ ہیں جن کے قرض اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی رحمت سے خود اتار دیں گے۔

8- روی ابن ماجه مرفوعا ان الدائن یقتص یوم القیامة الا من تدین فی ثلاث خلال ای خصال رجل تضعف قوته فی سبیل الله فیستدین لیتقوی به علی عدوه و رجل یموت عنده المسلم فلا یجد مایجهزه الا الدین و رجل خاف علی نفسه فینکح خشیة علی دینه فان الله تعالیٰ یقضی عن هولاء یوم القیامة (مرقاة المفاتیح ص 104 ج 6)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن قرض خواہ کو پورا پورا بدلہ دلایا جائے گا مگران لوگوں سے جنہوں نے تین وجھوں سے قرض لیا ہو۔ایک وہ شخص جس کی اللہ کی راہ میں قوت کمزور ہوگئی ہو۔(مثلاً ہتھیار ضائع ہوگیا ہو) اور وہ قرض لے تا کہ (ہتھیار خرید کر) دشمن پر اپنی قوت کو بڑھائے دوسرا وہ شخص جس کے سامنے کسی مسلمان کی موت ہوگئی ہو اور قرض لئے بغیر وہ اس کی تجہیز وتکفین نہ کرسکتا ہو اور تیسرا وہ شخص جو اپنے اوپر زنا میں مبتلا ہونے کا خوف رکھتا ہو تو وہ اپنے دین کو بچانے کیلئے قرض لے کر نکاح کرلے۔ یہ لوگ ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالی ان کی طرف سے قرض کی ادائیگی خود کریں گے۔

اسی حدیث کے مضمون کی وجہ سے ملاعلی قاری رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

ثم قیل الدائن الذی یحبس عن الجنة حتی یقع القصاص هو الذی صرف ماستدانه فی سفه او سفر و اما من استدان فی حق واجب کفاقة و لم یترک وفاء فان الله تعالیٰ لا یحبسه عن الجنة ان شاء الله تعالیٰ لان السلطان کان علیه ان یؤدی عنه فاذا لم یؤد عنه یقض الله

عنه بارضاء خصمائه.

پھر کہا گیا ہے کہ قرضدار جس کو حساب برابر کرنے تک جنت میں داخل میں داخلہ سے روک دیا جائے گا یہ وہ ہوگا جس نے لئے ہوئے قرض کو حماقت یا اسراف میں خرچ کیا ہو۔ رہا وہ جس نے کسی واجب حق کی وجہ سے مثلاً فاقہ کی وجہ سے قرض لیا ہو پھر اس کی ادائیگی کے بقدر مال نہ چھوڑا ہو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت پر داخلہ سے نہ روکیں گے کیونکہ ایسی صورت میں پہلے تو حکمران کے ذمہ آتا ہے کہ وہ بیت المال سے اس کا قرضہ ادا کرے اور جب اس نے ادا نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کریں گے اس طرح سے کہ اس کے قرض خواہوں کو اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے کچھ دے کر راضی کر لیں گے۔

یہاں یہ بات زیادہ غور طلب نہیں کہ ماذون غلام اور کمپنی کے ڈائریکٹر جو قرض حاصل کرتے ہیں ان کو کوئی سخت مجبوری تو کیا عام مجبوری بھی نہیں ہوتی۔

تیسری نظیر، مضارب اور رب المال

مولانا لکھتے ہیں۔

”جب تک رب المال مضارب کو دوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے مضاربت میں بھی رب المال کی ذمہ داری اس کے سرمائے تک محدود ہوتی ہے چنانچہ اگر رب المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید قرض لینے کی اجازت نہیں دی پھر کاروبار کے نتیجہ میں مضارب پر دیون واجب ہوگئے تو ایسی صورت میں رب المال کا زیادہ سے زیادہ اس کے سرمائے کی حد تک نقصان ہوگا اس سے زیادہ کا رب المال سے مطالبہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہوگا

کیونکہ اس نے رب المال کی اجازت کے بغیر قرضے لئے ہیں اس لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے۔ایسے ہی شیئر ہولڈر جو خود عمل نہ کر رہا ہے تو اس کی ذمہ داری کے محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اصول پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔

البہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ تقریباً تمام کمپنیوں کے پراسپکٹس میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ کمپنی ضرورت کے مواقع پر بنکوں وغیرہ سے قرض لے سکے گی اوراور جو لوگ کمپنی کے شیئر ہولڈرز بنتے ہیں ان کو یہ بات معلوم ہوتی ہے لہذا جب وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں تو ان کی طرف سے گویا معنوی اجازت ہے کہ کاروبار کیلئے قرض لیا جاسکتا ہے اور جب رب المال مضارب کو قرض کی اجازت دے دے تو اس کی ذمہ داری محدود نہیں رہتی۔

لیکن اس شبہ کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ پراسپکٹس ہی میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہو۔لہذا اس کی صحیح نظیر یہ ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔'' (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص 82)

ہم کہتے ہیں کہ مولانا کا یہ پورا کلام تین اعتبار سے محل نظر ہے۔

1- مولانا مدظلہ نے یہاں دین اور قرض کو خلط کر دیا۔مضاربت مطلق ہو تو

مضارب کوقرض لینے کا اختیار نہیں ہوتا جب تک رب المال خود اس کی مستقل طور پر اجازت نہ دیدے جبکہ مضارب کو نقد یا ادھار مال خریدنے اور فروخت کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ مال ادھار خریدنے سے دیون واجب ہوتے ہیں۔ مضارب نے رب المال کی اجازت کے بغیر قرض لئے ہوں تو ان کی ذمہ داری تو مضارب پر ہوگی لیکن دیون کی ذمہ داری تو رب المال پر ہوگی۔ مثلاً رب المال نے مضارب کو ایک لاکھ روپیہ دیا۔ مضارب نے پچاس ہزار کا سامان ادھار خریدا۔ پھر کسی قدرتی آفت سے یہ سارا مال اور نقدی ہلاک ہوگئی تو رب المال مزید پچاس ہزار کا ضامن ہوگا۔

1- ویملک المضارب فی المطلقة التی لم تقید...... البیع ولو فاسدا بنقد و نسیئة متعارفة (در مختار ص 540, 470)

ولا یملک الاقراض والا ستدانة و ان قیل له ذلک ای اعمل برایک لانهما لیسا من صنیع التجار فلم یدخلا فی التعمیم ما لم ینص المالک علیهما فیملکهما (درمختار ص 541 ج 4)

(قوله والاستدانة) کما اذا اشتری سلعة بثمن دین و لیس عنده من مال المضاربة شئی من جنس ذلک الثمن. فلو کان عنده من جنسه کان شراء علی المضاربة ولم یکن من الاستدانة فی شئی (رد المختار ص 541 ج 4)

2- مولانا مدظلہ کا یہ آخری جملہ کہ ''رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے'' اگر اس سے مراد مطلق قرض ہے خواہ کتنی ہی مقدار کا ہو تو اس شرط کو لگانا ہی فضول ہے کیونکہ مضاربت مطلق ہو تب بھی مضارب کو قرض لینے دینے کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ اختیار اسی وقت ملتا ہے جب رب المال خود اس کی مستقل طور پر اجازت دے دے۔

3- اور اگر مولانا مدظلہ کی مراد ہے کہ سرمائے کی حد تک رب المال مضارب کو قرض لینے کی اجازت دیتا ہے زیادہ کی نہیں جیسا کہ یہ بات مولانا کے اس جملہ سے عیاں ہے کہ ''حصہ داران کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمایے سے زیادہ نہ ہو۔'' تب بھی یہ بے بات کی بات ہے کیونکہ رب المال مضارب کو ایک لاکھ روپے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں قرض لینے کی اجازت ہے لیکن مجھ پر تمہارے لئے ہوئے قرض کا ذمہ میرے لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہوگا۔ مضارب اس مشروط اجازت پر کسی سے دس ہزار روپے قرض لیتا ہے اور کل ایک لاکھ دس ہزار کا سامان خریدتا ہے۔ پھر کسی قدرتی آفت سے سارا مال ہلاک ہو جاتا ہے۔ اب مضارب رب المال کو کہتا ہے کہ تم نے سرمائے کی حد تک قرض لینے کی اجازت دی تھی اور میں نے صرف دس ہزار کا قرض لیا ہے۔ لہٰذا تم اس قرض کے دینے کے ذمہ دار ہو۔ اور یہ صورت دس ہزار روپے تو کیا صرف دس روپے کے قرض میں بھی جاری ہوتی ہے۔

غرض قرض میں محدود ذمہ داری کی صورت صرف یہ ہے کہ رب المال مضارب کو قرض لینے کی اجازت سرے ہی سے نہ دے تاکہ نہ تو رب المال پر قرض کی ذمہ داری آئے۔ اور نہ ہی اس کو قرض کا فائدہ حاصل ہو جو اس طرح ہوتا ہے کہ مضارب قرض کی رقم بھی تجارت میں لگاتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ نفع زیادہ ہوتا ہے۔

اسی طرح کمپنی کے شیئر ہولڈرز کی قرض میں ذمہ داری صرف اسی صورت میں محدود ہوگی جب ان کی طرف سے ڈائریکٹران کو قرض لینے کی اجازت مطلقاً نہ ہو ورنہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ وہ قرض کے منافع تو کسی حد کے بغیر لینا چاہتے ہیں جبکہ قرض کی ذمہ داریوں کو اپنے اوپر محدود بلکہ مسدود رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بات **الغرم بالغنم**

کے ضابطہ کے خلاف ہے۔

II- مولانا عثمانی مدظلہ کی تجویز کہ محدود ذمہ داری صرف پبلک کمپنیوں تک رہے

مولانا مدظلہ لکھتے ہیں

So, the concept could be restricted, to the public companies only who issue their shares to the general public and the number of whose shareholders is so large that each one of them cannot be held responsible for the day- to- day affairs of the business and for the debts exceeding the assets.

As for the private companies or the partnerships, the concept of limited laibility should not be applied to them, because, practically, each one of their shareholders and partners can easily acquire knowledge of the day-to-day affairs of the business and should be held responsible for all its liabilities.

There may be an exception for the

sleeping partners or the shareholders of a private company who do not take part in the business practically and their liability may be limited as per agreement between the partners.

If the sleeping partners have a limited liability under this agreement, it means, in terms of Islamic jurisprudence, that they have not allowed the working partners to incur debts exceeding the value of the assets of the business. In this case, if the debts of the business increase from the specified limit, it will be the sole responsibility of the working partners who have exceeded the limit. (Meezanbank's guide to Islamic Banking p 231, 232)

لہٰذا یہ تصور صرف پبلک کمپنیوں تک محدود رکھا جاسکتا ہے جو اپنے حصص پبلک کے لئے جاری کرتی ہیں اور جن کے حاملین حصص اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو روزمرہ کے تجارتی معاملات اور اثاثوں سے زائد قرضہ جات کا ذمہ دار نہیں بنایا جاسکتا۔

جہاں تک پرائیویٹ کمپنی یا شراکت کا تعلق ہے تو ان میں محدود

ذمہ داری نہیں ہونی چاہئے کیونکہ ان کا ہر حامل حصص یا ہر شریک روزمرہ کے تجارتی معاملات پر واقف ہوسکتا ہے اور اس لئے وہ اس کی تمام ادائیگیوں کا ذمہ دار بن سکتا ہے۔ البتہ پرائیویٹ کمپنی کے غیر عمیل شریک (Sleeping Partner) یا حامل حصص جو تجارت میں عملاً شریک نہیں ہیں ان کی ذمہ داری محدود ہوسکتی ہے۔

اگر شرکاء کے مابین سمجھوتے کے تحت غیر عمیل شریک کو محدود ذمہ داری حاصل ہو تو فقہی اعتبار سے یوں سمجھا جائے گا کہ انہوں نے عمیل شرکاء کو اثاثہ جات سے زیادہ قرض لینے کی اجازت نہیں دی۔ اس صورت میں اگر کاروباری قرض اثاثہ جات کی مالیت سے تجاوز کر جائیں تو ان کی ذمہ داری محض عمیل پر ہوگی۔

ہم کہتے ہیں

مولانا عثمانی مدظلہ کی اس عبارت میں بھی چند باتیں محل نظر ہیں

1- مولانا نے پہلے تو یہ لکھا کہ ''پرائیویٹ کمپنی اور شراکت میں محدود ذمہ داری نہیں ہونی چاہئے'' اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ ''ان کا ہر حامل حصص یا ہر شریک کاروبار کے روزمرہ معاملات پر واقف ہوسکتا ہے اور اس لئے وہ اس کی تمام ادائیگیوں کا ذمہ دار بن سکتا ہے۔''

خط کشیدہ الفاظ یعنی ہر حامل حصص یا ہر شریک میں عموم کی وجہ سے غیر عمیل شریک بھی داخل ہے اور ہر وہ حامل حصص بھی جو تجارت میں عملاً شریک نہیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے مولانا یہ لکھتے ہیں ''البتہ پرائیویٹ کمپنی کے غیر عمیل شریک یا حامل حصص جو تجارت میں عملاً شریک نہیں ہیں ان کی ذمہ داری محدود ہوسکتی

ہے۔“

2- مولانا مدظلہ کی اس بات کو بھی تسلیم کرلیا جائے کہ پرائیویٹ کمپنی کے عمیل شرکاء جو تجارت میں عملاً شریک ہیں اور روزمرہ کے کاروباری معاملات اور کمپنی کے اثاثوں اور قرضہ جات کی تفصیل سے واقف ہوتے ہیں اور نہیں تو ہو سکتے ہیں ان کی ذمہ داری محدود نہیں ہونی چاہئے تو پھر یہی بات ہم، پبلک کمپنی کے ڈائریکٹران کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ روزمرہ کے کاروباری معاملات سے واقف ہوتے ہیں اور تمام اثاثوں اور قرضہ جات کی تفصیل ان کے سامنے ہوتی ہے کیونکہ وہ خود ہی سب کچھ کر رہے ہوتے ہیں لہٰذا ان کی ذمہ داری بھی محدود نہیں ہونی چاہئے۔ علاوہ ازیں خود مولانا مضارب اور رب المال کی نظیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لیکن یہاں شرعی نقطہ نظر سے اصل اشکال یہ ہے کہ مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے مگر مضارب کی ذمہ داری محدود نہیں ہوتی۔ لہٰذا دائنین رب المال کے سرمائے میں زائد دیون مضارب سے وصول کر سکتے ہیں چنانچہ دائنین کا ذمہ خراب نہیں ہوتا۔“ (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص 82)

غرض مولانا مدظلہ کی خود کی بتائی ہوئی مضاربت کی نظیر کو دیکھیں یا اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ پبلک کمپنی کے ڈائریکٹران تمام امور سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ خود متصرف بھی ہوتے ہیں۔ مولانا مدظلہ کے پاس پبلک کمپنی کے ڈائریکٹر اور پرائیویٹ کمپنی کے ڈائریکٹر کے درمیان فرق کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے اور وہ جواب میں صرف اتنا کہتے ہیں کہ:

”لیکن کمپنی کے ڈائریکٹران کی ذمہ داری بھی محدود ہے اور خود کمپنی جو شخص قانونی ہے اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے۔“

حالانکہ غور کرنے کا مقام یہی تو ہے کہ جب ڈائریکٹران کے ذمہ داری ہونے

کے تمام اسباب موجود ہیں تو پھر غیر شرعی ملکی قانون نے ان کو کیوں نظر انداز کیا اور ایک فرضی شخص کا سہارا لے کر ان کو مالی تحفظ کیوں فراہم کیا اور کیا شریعت اس کی تائید یا تصویب کرتی ہے۔

III- کمپنی کی محدود ذمہ داری کے حق میں دی گئی مولانا عثمانی کی ایک اور دلیل اور اس کا جواب

مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں۔

''خصوصاً جبکہ کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے میرا حق صرف اثاثوں کی حد تک محدود ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ لمیٹڈ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر کمپنی کی بیلنس شیٹ بھی شائع ہوتی رہتی ہے۔ قرض دینے والا بیلنس شیٹ کے ذریعے سے کمپنی کا مالی استحکام دیکھ کر قرض دیتا ہے۔ غرضیکہ جو شخص بھی لمیٹڈ کمپنی سے معاملہ کرتا ہے وہ علی بصیرۃ کرتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا فراڈ نہیں ہوتا۔'' (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص 83)

مولانا مدظلہ کی بات کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں دین وقرض کی ذمہ داری سے سبکدوشی کے صرف دو ہی طریقے ہیں، یا تو مقروض کی جانب سے ادائیگی یا قرض دہندہ ودائن کی جانب سے معافی۔

الدین الصحیح ھو فی التنویر وغیرہ مالا یسقط الا بالاداء او الابراء (شرح المجلہ ص 24 ,37)

اب جب شریعت قرض ودین سے سبکدوشی کے صرف دو ہی طریقے بتاتی ہے اور ان کے نہ ہوتے ہوئے قرض ودین کی ذمہ داری کو قیامت تک باقی بتاتی ہے اور

قرض لینے کی کوئی مجبوری بھی نہیں ہے تو محدود ذمہ داری صرف سرمایہ دارانہ ذہنیت کا تحفظ ہے۔تو اس کا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اس میں تین باتیں اور بھی ہیں۔

1- جیسے ہم نے مثال دے کر بتایا تھا کہ نقصان کسی قدرتی آفت سے اچانک بھی ہو سکتا ہے۔لہٰذا کمپنی کے مالی استحکام کو دیکھ کر دین کا معاملہ کرنے کے باوجود دائن کو نقصان اٹھانے کی نوبت آسکتی ہے جس کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہو۔

2- کمپنی کو قرض عام طور سے بینکوں اور مالیاتی اداروں سے ملتے ہیں جو کمپنی سے بھی بڑھ کر سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔وہ رہن وگروی کے بغیر تو قرض دیتے ہی نہیں۔کمپنی کے مالی خسارہ یا خستہ حالات کے باوجود اگر وہ مالیاتی ادارے رہن کی اصل مالیت سے کہیں بڑھ کر قرض دیتے ہیں تو ایسا ان کے ملازمین کی کمپنی کے ساتھ ملی بھگت سے ہی ہو سکتا ہے۔

3- کمپنی کی مالی حالت کچھ کمزور دیکھ کر بھی اگر کوئی اس کے ساتھ دین کا معاملہ کرتا ہے تو دین کی وصولی کی توقع پر کرتا ہے۔خواہ اصالتہ یا تحلیل شدہ کمپنی کے اثاثوں سے۔معافی کی نوبت تو اس کے بعد آتی ہے اور کمپنی کو قانونی طور پر جو محدود ذمہ داری حاصل ہے اس کی بنیاد پر اس کی طرف معافی طلب کرنے کو منسوب بھی نہیں کیا جا سکتا اور جب کمپنی کی جانب سے معافی کی طلب نہیں ہے تو دائن کی طرف بھی معاف کرنے کو مقدر نہیں مانا جا سکتا۔

لہٰذا مولانا مدظلہ کا یہ فرمانا کہ ''جو شخص بھی لمیٹڈ کمپنی سے معاملہ کرتا ہے وہ علی بصیرۃ کرتا ہے اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا فراڈ نہیں ہوتا'' حقیقت سے بہت دور ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ قرض دہندہ کی جانب سے ابراء اگر معلق ہو اور وہ یوں کہے کہ فلاں حالت میں مدیون بری ہوگا اور اس کو دین معاف ہوگا تو یہ جائز ہے اور اسی کی

بنیاد پر مجمع الفقہ الاسلامی نے محدود ذمہ داری کو جائز قرار دیا ہے تو اس کے جواب میں:

ہم کہتے ہیں

1- کمپنی قائم ہوتے ہوئے ہی اپنے لئے محدود ذمہ داری کا قانونی حق حاصل کر لیتی ہے جو شریعت کی نظر میں ظلم ہے۔

2- ابراء دائن و مدیون کے درمیان کا باہمی معاملہ ہے جس میں دائن کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ مدیون کو دین معاف کرے یا نہ کرے یا کرے تو معلق کرے جب کہ یہاں محدود ذمہ داری کے قانون کی وجہ سے دائن کا اختیار ہی مسلوب ہے۔

3- دائن کی طرف سے ابراء معلق بھی کسی وقت نہیں پایا جاتا حالانکہ ابراء اس کا کام ہے۔ اس کی طرف سے صرف خاموشی ہوتی ہے۔

4- شخص حقیقی کی موت یا مفلسی پر دین کی معافی کو معلق کرنا قابل فہم ہے۔ لیکن یہاں شخص حقیقی پر شخص قانونی کو قیاس کرنا باطل اور قیاس مع الفارق ہے کیونکہ ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ''وقف اور بیت المال محض معنوی یا بے جان ہونے کی وجہ سے نہ خود اپنے حقوق کی تحصیل کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے متولی یا نگران مقرر کیا جاتا ہے جو ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ ان اداروں کے اثاثہ جات سے چونکہ اس متولی کا کوئی مالکانہ تعلق نہیں ہوتا اس لئے حقوق و ذمہ داریوں کو اس سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اور مجبوراً ادارہ ہی کی طرف ان کو منسوب کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ادارہ کو معنوی یا قانونی شخص کہا جاتا ہے۔

اور جہاں کوئی ادارہ ایسا ہو کہ اس کے متولی یا منتظم کی سرمایہ کاری اور اس کے مفادات اس ادارے سے وابستہ ہوں اور اس کے تصرفات کا فائدہ بالواسطہ یا

بلا واسطہ خود اسی کو ہو تو حقوق و ذمہ داریاں خود اسی کے ساتھ وابستہ ہوں گی۔ اس صورت میں ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے کہ ہم ان حقیقی اشخاص کو نظر انداز کر کے ادارے کی فرضی شخصیت کا اعتبار کریں اور حقوق و ذمہ داریوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ لہٰذا حقوق و ذمہ داریوں کی نسبت لامحالہ حقیقی شخص کی طرف ہو گی۔

مسئلہ: 2

کیا شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہے؟

بسم اللہ حامدا و مصلیا

شیئرز کی حقیقت

شیئرز کی حقیقت یہ ہے کہ اولاً تو یہ شرکتِ اموال ہے اور پھر عقدِ اجارہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب ایک کمپنی قائم کی جاتی ہے تو اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداءً چند سرمایہ کار (جو ترقی دینے والے حصہ دار کہلاتے ہیں) ایک سکیم مرتب کر کے اور قواعد و ضوابط متعین کر کے متعلقہ سرکاری محکمہ سے اپنی رجسٹریشن کراتے ہیں۔ اسی طرح کسی معتبر بینک سے یہ ضمانت حاصل کی جاتی ہے کہ اگر پیش کردہ حصص پر سرمایہ فراہم نہ ہو سکے تو بینک اتنے اتنے حصے خریدنے کو تیار ہے۔ رجسٹریشن کے بعد اشتہار کے ذریعے کمپنی میں بذریعہ شیئرز (حصص) شرکت کی کھلی اور عمومی پیشکش کی جاتی ہے۔ کبھی پہلے سے موجود کمپنی بھی اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے عوام کو سرمایہ کاری کے لئے کھلی پیش کش کرتی ہے۔ خواہشمند لوگ اپنی اپنی قوت اور منشا کے مطابق کم یا زیادہ حصے خریدتے ہیں۔ اس طرح سے حصص کے خریداروں اور ابتدائی سرمایہ کاری کرنے والوں کا سرمایہ مل کر مشترک ہو جاتا ہے یہ شرکتِ اموال کی صورت بن جاتی ہے۔ ابتداء میں بظاہر تو یہ حصص کی خرید ہوتی ہے،

لیکن درحقیقت یہ مختلف لوگوں کا اپنے سرمایہ کو اکٹھا کرنے کی صورت ہے۔

یہ سرمایہ جو شیئرز کی خرید کی صورت میں مہیا کیا جاتا ہے اس لئے کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے ڈائریکٹران وغیرہ اس سرمایہ میں کاروبار کریں۔ کمپنی کے ڈائریکٹران اس کام پر اجرت وصول کرتے ہیں جو کمپنی کے اخراجات کی مد میں شمار ہوتی ہے۔ تمام اخراجات نکال کر جو نفع ہوتا ہے وہ شیئر ہولڈرز (یعنی اصحاب حصص) پر ان کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم کردیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ کیا جاتا ہے کہ سرمایہ کو مثلاً دس دس روپے کے حصص کی صورت میں لیا جاتا ہے اور نفع کو کل حصص میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ کمپنی کے ڈائریکٹران اپنی محنت کی اجرت وصول کرتے ہیں اور اپنے سرمایہ پر فی حصہ نفع میں دوسرے حصہ داروں کے ساتھ مساوی طور پر شریک ہوتے ہیں، لہٰذا یہ شرعاً اجارہ (یعنی اجرت پر کام کرنے) کی صورت ہے۔ اور اگرچہ عرف عام میں اس کو شرکت کہا جاتا ہے۔ لیکن شرعی نقطہ نظر سے یہ معاملہ شراکت کا نہیں ہے، بلکہ اجارہ کا ہے۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کا موقف اور اس کی تحقیق

ہماری اس تحقیق کے برعکس مولانا تقی عثمانی مدظلہ اور ان کے صاحبزادے مولوی عمران اشرف عثمانی اس کو شرکت عنان کہنے پر مصر ہیں۔ اس لیے ہم ان کی تحقیق کا جائزہ لیتے ہیں:

مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں کمپنی اور شرکت کے درمیان چند فرق ذکر کئے ہیں جو ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہیں:

1- شرکت میں ہر شخص کاروبار کے تمام اثاثوں کا مشاع طور پر

مالک ہوتا ہے۔ ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے۔ ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے مثلاً کوئی دین واجب ہوا تو تمام شرکاء سے برابر درجے میں مسؤلیت ہوگی مگر کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔

2- شرکت میں کوئی شریک شرکت فسخ کر کے اپنا سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے مگر کمپنی سے اپنا سرمایہ نہیں نکالا جا سکتا البتہ حصص فروخت کیئے جا سکتے ہیں۔

3- شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا کمپنی کا الگ سے قانونی وجود ہوتا ہے جس کو شخص قانونی کہتے ہیں۔

4- شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی جب کہ کمپنی کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔(ص61,62)

ہم کہتے ہیں

ان کے علاوہ ایک اور فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ شرکت میں شریک حضرات میں صرف نفع تقسیم ہوتا ہے۔ وہ تنخواہ نہیں لے سکتے جب کہ کمپنی کے ڈائرکٹران تنخواہ اور بھتے بھی وصول کرتے ہیں۔

ہمارے اس بتائے ہوئے فرق کے جواب میں:

احسن الفتاوی ج 7 میں مندرج مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے فتوے کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس فتوے میں شریک فی المال سے اجرت پر کام کرانے کا ذکر ہے شریک شرکت عنان سے اجرت پر کام کرانے کا ذکر نہیں ہے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ نے جو مسائل ذکر کیئے ہیں وہ اس قسم کے ہیں:

قال الامام الحصکفی رحمه الله تعالیٰ ولو استاجره لحمل طعام

مشترک بینهما فلا اجرله......“ ص 321 ج 7 احسن الفتاوی.

قال الامام المرغینانی رحمه الله استاجره لیحمل نصف طعامه بالنصف الآخر حیث لا یجب له الاجر لان المستاجر ملک الاجر فی الحال بالتعجیل فصار مشترکا بینهما و من استاجر رجلا لحمل طعام مشترک بینهما لا یجب الاجر لان مامن جزء یحمله الا وهو عامل لنفسه. (احسن الفتاویٰ ص322 ج 7)

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کا تذبذب

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کمپنی کی شرعی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب اسلام اور جدید معیشت وتجارت میں لکھتے ہیں اور اپنے تذبذب کا اظہار کرتے ہیں۔

”......کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں۔ فقہاء نے شرکت کی چار قسمیں ذکر کی ہیں۔ اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے تو پانچ قسمیں بن جاتی ہیں۔ کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں جیسا کہ پہلے شرکت اور کمپنی میں فرق بتائے جا چکے ہیں۔

اب یہاں علمائے معاصرین کے تین نقطہ نظر ہیں۔

ایک یہ کہ شرعا شرکت ان پانچ قسموں میں منحصر ہے اور کمپنی ان میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ......فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر کی ہیں وہ

منصوص نہیں، بلکہ فقہاء نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے
اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے......لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان
اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے
خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطہ نظر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔
انہوں نے فرمایا ہے کہ اپنی حقیقی روح کے اعتبار سے کمپنی شرکت عنان
میں داخل ہے (امداد الفتاویٰ ص 464 ج 3) اگرچہ کمپنی کی بعض ایسی
خصوصیات ہیں جو معروف شرکت عنان میں نہیں پائی جاتیں لیکن ان کی
وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔(ص 79)

مولانا عثمانی صاحب کی یہ عبارت عجیب سی ہے۔ کمپنی اور شرکت کے درمیان
فرق بیان کرتے ہوئے شرکت کو مطلق ذکر کیا جس کا مطلب ہوا کہ شرکت عقد کی جمیع
صورتیں اس میں داخل ہیں خواہ وہ معرف چار ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور غیر معروف
بھی ہو اور کمپنی ان سب سے جدا ہے۔ پھر مولانا نے کمپنی کو شرکت کی (ایک اور) قسم
بنالیا اور پھر مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی عبارت کی روشنی میں یہ بتا دیا کہ اس میں
عنان کی حقیقت بھی باقی ہے۔

غرض کمپنی سے پہلے شرکت کی مطلقاً نفی کی پھر اس نفی کی نفی کرتے ہوئے اس کو
درجہ بدرجہ شرکت عنان میں داخل کر دیا اور ان کے صاحبزادے مولوی عمران اشرف
عثمانی صاحب نے تو اس کے شرکت عنان ہونے کی کھلی کھلی تصریح کر دی۔

As mentioned in the books and research papers of Islamic jurists, companies come under the ruling of

Shirkat-ul-Ainan. (Meazanbank's guide to Islamic Banking)

جیسا کہ فقہائے اسلام کی کتابوں اور تحقیقی مقالوں میں مذکور ہے کمپنیاں شرکت عنان کے تحت آتی ہیں۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی یہ عبارت بھی ان کے تذبذب کی وجہ سے ہے۔

''......اسی طرح کمپنی ابتداء لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ تم اس کاروبار میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ لہٰذا جو شخص اس وقت میں شیئر حاصل کر رہا ہے وہ گویا کہ شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔'' (شیئرز کی خرید وفروخت ص 8)

کیونکہ یہ کہنے کے بعد کہ ''تم اس کاروبار میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ'' اس کہنے کا کیا مطلب ہوا کہ ''وہ گویا کہ شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔'' مولانا کو تو یوں کہنا چاہئے تھا کہ ''وہ درحقیقت شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔''

مولانا مدظلہ کے لیے تذبذب سے نکلنے کا راستہ

ہم کہتے ہیں کہ اگر مولانا تقی عثمانی صاحب ہماری تجویز سے اتفاق کریں تو وہ اپنے تذبذب سے نکل سکتے ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ یہ اولا شرکت املاک ہے اور پھر عقد اجارہ ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حصص کے خریدار اور ابتدائی سرمایہ کار اپنے مال ملا کر اکٹھا کر لیتے ہیں اور یوں ان کے مال میں شرکت قائم ہو جاتی ہے۔ پھر ڈائریکٹرز کا چناؤ کیا جاتا ہے جو اجرت اور بھتوں کے عوض میں اس مشترکہ سرمایہ پر کام کرتے ہیں اور نفع کو ہر ایک کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ شرکت املاک کے بعد شرکت عقد نہیں ہے اجارہ ہے۔

دارالعلوم کا ایک فتوی

لیکن دارالعلوم کراچی کے ایک فتوے مورخہ 19 ربیع الثانی 1425ھ نے جس پر مولانا تقی عثمانی صاحب کے بھی دستخط ہیں ہماری تجویز کو رد کرتے ہوئے لکھا۔

''کمپنی کے وجود میں آنے کے لئے ''عقد اجارہ'' ضروری نہیں ہے بلکہ اصلا یہ ایک ''عقد مشارکہ'' ہے اور جب کمپنی وجود میں آ جاتی ہے اور عوام اس میں حصہ دار بنتے ہیں تو ایک مخصوص مدت کے اندر اس کا عام اجلاس بلایا جاتا ہے جس میں تمام شیئر ہولڈرز کی ووٹنگ سے کمپنی کے ڈائرکٹران منتخب کئے جاتے ہیں جو کمپنی کے کاروبار کو چلاتے ہیں اور اس کے لئے محنت کرتے ہیں۔

یہ ڈائرکٹران کبھی اپنے کام پر تنخواہ لیتے ہیں اور کبھی نہیں لیتے۔ اگر وہ تنخواہ وصول نہ کریں تو ڈائرکٹران اور عام شیئر ہولڈرز کے درمیان سرے سے کوئی عقد اجارہ ہے ہی نہیں اور اگر وہ تنخواہ وصول کرتے ہوں تو ان کے درمیان ایک عقد اجارہ ضمنی طور پر وجود میں آتا ہے۔''

ہمارا جواب

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ کمپنی کے وجود میں آنے کے لئے محض اتنی شرط ہوتی ہے کہ چند سرمایہ کار سرمایہ مہیا کریں اور ایک سکیم مرتب کر کے اور قواعد و ضوابط طے کر کے حکومت سے اس کی رجسٹریشن کرا لیں۔ انہیں قواعد وضوابط میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ منتخب ہونے والے ڈائرکٹران اجرت پر کام کریں گے۔ غرض پہلے ہی سے اجرت پر کام کرنے کی سکیم طے ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے تو شرکت عنان طے ہوئی پھر اس کے ہوتے ہوئے ضمناً عقد اجارہ پایا جا رہا ہو۔

رہی یہ بات کہ ڈائرکٹران کبھی تنخواہ نہیں لیتے تو اول تو ایسی کمپنیاں نہ ہونے کے برابر ہیں، دوسرے بنیادی تنخواہ نہ لیتے ہوں لیکن الاؤنسز کی نفی کرنا مشکل ہے اور تیسرے یہ کہ ڈائرکٹران میں سے کوئی بھی اور کبھی بھی نہ لے یہ اور بھی نادر ہے۔ اور نادرالوقوع پر حکم کا دارومدار نہیں رکھا جاتا۔

غرض کسی مرحلہ میں بھی شرکت عنان کا معاملہ نہیں کیا جاتا بلکہ کمپنی کے قواعد و ضوابط میں یہ طے ہوتا ہے کہ کمپنی کے منتخب ہونے والے ڈائرکٹر کمپنی کے کاروبار کو چلائیں گے اور اپنی محنت پر اجرت لیں گے۔ محض کمپنی کہلانے سے معاملہ شرکت عنان کا نہیں بن جاتا۔ شرکت عنان میں عامل شریک کو اپنی محنت اور اپنے سرمایہ دونوں کا اعتبار کر کے نفع میں سے متناسب حصہ ملتا ہے۔ اجرت کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہوتا۔ ہاں اصل سرمایہ میں سے اجرت لینے کا ذکر ہوتا ہے۔ جب قواعد وضوابط ہی میں اجرت پر کام کرنے کا ذکر ہے تو یہ عقد اجارہ ہونے کو متعین کر دیتا ہے۔

شیئرز کی خرید و فروخت کا شرعی حکم

شیئرز کی خرید و فروخت مندرجہ ذیل خرابیوں کی وجہ سے ناجائز ہے:

1- کمپنی کے لئے محدود ذمہ داری کا ہونا

اس شرط سے شیئرز خریدنا کہ شیئرز کی مالیت کی مقدار سے زیادہ نقصان کی صورت میں وہ زائد نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا ناجائز ہے کیونکہ جب ڈائریکٹران اس کی طرف سے بھی کاروبار کرتے ہیں تو اس کے حصہ میں ہونے والے پورے نقصان کا وہ ذمہ دار ہے اور محدود ذمہ داری کے غیر شرعی قانون کے ذریعہ سے وہ بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔

2- ڈائرکٹران کی اجرت مجہول ہے۔

وہ کمپنیاں جو بالفرض کسی سودی لین دین میں ملوث نہ ہوں شیئرز خریدکران میں حصہ دار بننے کے جواز میں جو ایک مانع ہے وہ یہ ہے کہ ڈائریکٹران وغیرہ کی اجرتیں مجہول ہوتی ہیں یعنی معاملہ کرتے ہوئے علم نہیں ہوتا کہ وہ کتنی اجرت وصول کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بنیادی تنخواہیں معین ہوتی ہیں، لیکن ان کے بھتوں اور الاؤنسز (Allowances) کی مقدار پہلے سے متعین نہیں ہوتی، چونکہ یہ الاؤنس بھی درحقیقت ان کی اجرت وتنخواہ کا حصہ ہوتے ہیں اس لئے ان کی مقدار کے نامعلوم ہونے سے کل اجرت مجہول رہ جاتی ہے اور یہ بات اجارہ کے صحیح ہونے کے منافی ہے۔ یہ جہالت یسیرہ بھی نہیں ہوتی یعنی اتنی معمولی بھی نہیں ہوتی کہ اس کو نظرانداز کیا جاسکے، کیونکہ Allowances کے نام پر تنخواہ سے بھی کہیں زیادہ فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک کمپنی کی سالانہ رپورٹ میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ اس کے Chief Executive (چیف ایگزیکٹو) کی 1994ء کے سال کی تنخواہ تین لاکھ تیس ہزار روپے تھی، جب کہ بھتوں اور الاؤنسز کی صورت میں اس نے ساڑھے چار لاکھ سے زیادہ کے فوائد حاصل کئے۔ نیز کمپنی کی جانب سے کار بھی مہیا کی گئی (نہ جانے ایک ہی تھی یا زائد تھیں) جس کے تمام اخراجات کمپنی کے ذمے تھے۔ علاوہ ازیں Free furnished accomodation یعنی آرائش شدہ رہائش بھی مفت مہیا کی گئی۔ یہ خرچ کمپنی کے دیگر اخراجات میں شامل کرکے دکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور کمپنی کے دو ڈائریکٹروں نے 1993ء کے سال میں رہائشی الاؤنس اناسی ہزار (79000/-) وصول کیا جب کہ 1994ء میں انہوں نے اس مد میں دو لاکھ چالیس ہزار روپیہ وصول کیا۔

غرض چونکہ ان ڈائریکٹران وغیرہ کی کل اجرت مجہول و نا معلوم ہوتی ہے، لہٰذا یہ اجارہ فاسد ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں دارالعلوم کا فتویٰ کہتا ہے۔

''چونکہ اس عقد اجارہ میں ڈائرکٹران کی تنخواہیں اور الاؤنسز عرفاً متعین ہوتی ہیں مجہول نہیں ہوتیں اس لئے اس میں قابل اشکال کوئی بات نہیں ہے۔''

فتوے کی اس عبارت پر ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہئے۔ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بات کا ایک بار پھر مطالعہ کر لیا جائے۔

کوئی یہ خیال کرے کہ یہ جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہوتی لہٰذا اس کا تحمل کیا جا سکتا ہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ اول تو لوگوں کو ان مسائل کا علم ہی نہیں اور دوسرے ان کا کوئی بس بھی نہیں چلتا اس لئے کوئی آواز نہیں اٹھتی ورنہ فی ذاتہ تو وہ نزاع کا باعث ہے۔

3- کمپنی کے ڈائرکٹران کا سودی لین دین کرنا

وہ کمپنیاں جو سودی لین دین میں ملوث ہوں اور الا ماشاء اللہ تقریباً سب ہی اس میں ملوث ہیں شیئرز خریدکر ان میں حصہ دار بننے کے جواز میں مذکورہ بالا مانع کے علاوہ ایک اور مانع بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ عقد اجارہ جو کہ کمپنی کے ڈائریکٹران اور شیئرز ہولڈر کے درمیان طے پاتا ہے۔ اس میں ایک شرط فاسد بھی ہے جو یہ ہے کہ کمپنی کے ڈائریکٹران کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کمپنی کے Behalf پر قرضہ لے سکتے ہیں اور اس پر سود کی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ یہ بات چونکہ ڈائریکٹران کے اختیارات کے بیان میں اور کمپنی کے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن Memorandum of

association میں مذکور ہوتی ہے لہٰذا جب کوئی شخص کمپنی کے شیئرز ابتداء میں یا درمیان میں خریدتا ہے تو وہ اس شرط کو تسلیم کرتے ہوئے خریدتا ہے اور چونکہ یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے لہٰذا فاسد ہے جس سے عقد اجارہ فاسد ہوا۔

ایک کمپنی کے ڈائریکٹران کے بیان میں اس طرح درج ہے:

The directors are empowered by the company`s articles of association to borrow or raise money or secure payment of any sum or sums of money for the purpose of the company's business.....

کمپنی کے آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن کے تحت ڈائریکٹران کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کمپنی کے کاروبار کی خاطر کسی بھی مقدار میں قرضہ لے سکتے ہیں یا رقم اکٹھی کر سکتے ہیں۔

اس طرح ایک کمپنی کے میمورنڈم میں یوں درج ہے:

To borrow money from time to time required for any of the purpose of the company by receiving advances of any sum or sums of money with or with-out security upon such terms as the directors may deem expedient ....

To issue or guarantee the issue of or the payment of interest on the shares,

debentures, debenturestock or other security or obligation of this company......

کمپنی کے ڈائرکٹران کو اختیار رہوگا کہ کمپنی کے مفاد کی خاطر وقتاً فوقتاً ضرورت کے بقدر رقم قرض لے سکتے ہیں۔اس کے لئے وہ پیشگی رقوم بھی لے سکتے ہیں اور ضمانت کے ساتھ یا بلا ضمانت ان شرائط پر بھی قرض لے سکتے ہیں جو وہ مناسب سمجھیں......وہ حصص پر، ڈبینچر ز پر، ڈبینچر سٹاک پر یا امانت پر یا کمپنی کی کسی اور واجب الادا رقم پر سود دے سکتے ہیں۔

اس شرط فاسد کا بیان یہ ہے کہ ڈائریکٹران جب کوئی قرض لیتے ہیں تو وہ اپنے نام پر نہیں لیتے، بلکہ کمپنی کے نام پر لیتے ہیں اور اس کی واپسی اور سود کی ادائیگی کی ذمہ دار کمپنی ہوتی ہے، لہٰذا وہ قرض کمپنی میں سرمایہ کاری کرنے والے تمام افراد (یعنی ڈائریکٹران اور شیئرز ہولڈرز وغیرہ) پر ان کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم ہو جاتا ہے۔اب ہر سرمایہ کار اپنے اپنے سرمایہ (یا عدد حصص) کے بقدر قرضہ کی واپسی اور اس پر سود کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔اگر کمپنی کو نقصان ہو تو قرضہ کی واپسی اور سود کی ادائیگی شیئر ہولڈرز کے اصل سرمایہ میں سے کی جاتی ہے۔اور اگر کمپنی کو نفع ہو تو شیئر ہولڈر کو ہونے والے نفع سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے۔

یہ تو قرضہ لینے کی صورت میں ہے۔ایک اور وہ صورت ہے جب کمپنی اپنا فاضل سرمایہ کسی بینک میں رکھ کر سود حاصل کرے اور اس سود کو نفع میں شامل کر کے شیئر ہولڈرز میں تقسیم کرے۔

اگرچہ مولانا تقی عثمانی صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ:

''شاید ہی کوئی کمپنی ایسی ہوگی جو کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو۔یہ کمپنیاں دو طریقے سے سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ یہ کمپنیاں فنڈ بڑھانے کے لئے بنک سے سود پر قرض لیتی ہیں اور اس قرض سے اپنا کام چلاتی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے پاس جو زائد اور فاضل رقم ہوتی ہے وہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہے اور اس پر وہ بنک سے سود حاصل کرتی ہے، وہ سود بھی ان کی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے''۔ (شیئرز کی خرید وفروخت ص 17)

اور ہم مان لیتے ہیں کہ اب کچھ ایسی کمپنیاں وجود میں آگئی ہوں گی کہ جو سودی کاروبار میں ملوث نہ ہوں لیکن بہر حال وہ پھر بھی اقل قلیل ہیں۔

شیئرز کی خرید وفروخت کے جواز میں دار العلوم کے فتوے کی وکالت

لیکن دار العلوم کے فتوے کی جاندار وکالت دیکھئے۔ لکھتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ ہر کمپنی کے نظام میں قرضے لینے کا ذکر اور اس کی شرط نہیں ہوتی۔ پھر جن کمپنیوں کے نظام میں قرضے لینے کا ذکر ہوتا ہے ان سب میں قرضے کے ساتھ ''سود'' کا لفظ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان دو صورتوں میں تو سرے سے کوئی شرط نہیں ہے۔ ہاں بعض کمپنیوں میں سود کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگرچہ شرط فاسد پائی جاتی ہے مگر یہ شرط عقد مشارکہ کے اندر ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا کمپنی کی اصل عقد مشارکہ ہے اور عقد مشارکہ ان عقود میں سے ہے جو شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتے بلکہ خود وہ شرط باطل شمار ہوتی ہے۔

فی البحر الرائق (296/5) نقلًا عن الفتاوی الصغری.

ذکر خواھر زادہ فی اول المضاربة الشرکات لا تبطل بالشروط الفاسدة''

کوئی دار العلوم کے ان حضرات سے پوچھے کہ کمپنی کے نظام میں اگر قرض لینے کا ذکر اور اس کی شرط نہیں ہوتی تو کیا وہ کمپنی قرض کے بغیر ہی کام چلاتی ہے۔ اگر اس کا قرض لینا معروف ہے یا معلوم ہے کہ قرض کے بغیر کوئی کمپنی نہیں چلتی تو **المعروف کالمشروط** کا قاعدہ تو قائم ہے۔ اسی طرح جب قرض لینے کا ذکر ہو لیکن اس کے ساتھ سود کا ذکر نہ ہو تو **المعروف کالمشروط** کا قاعدہ ختم نہیں ہو جاتا۔

پھر وہ عقد شرکت عنان نہیں اجارہ ہے جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں تو دار العلوم والوں کا یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا کہ شرکت شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتی بے کار محض ہے۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے نزدیک شیئرز کی خرید وفروخت کا مشروط جواز

ہمارے موقف کے برعکس چونکہ مولانا تقی عثمانی مدظلہ مذکورہ صورتحال میں بھی شیئرز کی خرید وفروخت کو جائز سمجھتے ہیں اس لیے وہ اپنے موقف اور استدلال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے تو پھر دو شرطوں کے ساتھ اس کمپنی کے شیئرز لینے کی گنجائش ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا یہی موقف تھا اور ان دونوں حضرات کی اتباع میں میں بھی اس موقف کو درست سمجھتا ہوں۔ وہ دو شرطیں یہ ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شیئر ہولڈر اس کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز ضرور اٹھائے اگر چہ اس کی آواز مسترد (Over-rule) ہو جائے اور میرے نزدیک آواز اٹھانے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کی جو

سالانہ میٹنگ (Annual general meeting) ہوتی ہے اس میں یہ آواز اٹھائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے، سودی لین دین پر راضی نہیں ہیں اس لیے اس کو بند کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہوگی اور یقیناً اس کی یہ آواز مسترد ہوگی۔ لیکن جب وہ یہ آواز اٹھائے تو حضرت تھانویؒ کے قول کے مطابق ایسی صورت میں وہ انسان اپنی ذمہ داری پوری ادا کر دیتا ہے (شیئرز کی خرید وفروخت ص 19-17)

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فتوی جس کی طرف مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے اشارہ کیا ہے یہ ہے:

''سو جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس کی اطلاع نہ ہو اس نے تو کارکنان کمپنی کو ان دو امر (یعنی سود کے لینے اور دینے) کا وکیل ہی نہیں بنایا اس لئے کارکنوں کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کر دیں گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی''۔

(امداد الفتاوی ج 3 ص 489)

مولانا تھانویؒ کے فتوے کا جواب

ہم کہتے ہیں کہ

مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ علم نہ تھا کہ کمپنی کے میمورینڈم Memorandum of association اور آرٹیکلز

Articles of Association بھی ہوتے ہیں جن کو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور حصص کی خرید وفروخت تمام کی تمام ان ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ان کے تمام نکات عقد میں مشروط وملحوظ ہوتے ہیں۔لہٰذا حصص کی خرید کے ساتھ جو اجارہ اقتضاء منعقد ہوتا ہے وہ فاسد ہوتا ہے۔

خود مولانا رحمہ اللہ نے بھی جو کہا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس کی اطلاع ہو وہ تصریحا اس سے ممانعت کر دے یعنی حصہ کو خریدتے وقت کمپنی کے عہدیداروں کو کہہ دے یہ نہیں کہ جانتے بوجھتے پہلے تو حصص خرید لے بعد میں کسی اجلاس عام میں اس کے خلاف آواز اٹھائے۔ یہ عقد ایک دفعہ فاسد ہو جائے تو ایک عرصہ کے بعد آواز اٹھانے سے اس کا فساد کیسے مرتفع ہوگا جب کہ اس دوران سودی لین دین بھی ہوتے رہے ہوں۔علاوہ ازیں اگر حصہ کی خرید کے وقت صراحتاً منع کرنے پر کمپنی کی طرف سے یہ جواب ملے کہ ہم تو سودی لین دین کرتے رہیں گے تو کیا حصہ دار اب بھی بری الذمہ رہے گا۔

مولانا عثمانی مدظلہ کے نزدیک جواز کی چار شرطیں

مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

شیئرز کی خرید وفروخت کے جواز کے لیے کل چار شرطیں ہو گئیں

i- کمپنی حرام کاروبار نہ کر رہی ہو مثلاً وہ سودی بینک نہ ہو۔سود وقمار پر مبنی انشورنس کمپنی نہ ہو۔شراب یا دوسرے حرام مال کا کاروبار کرنے والی نہ ہو وغیرہ۔

ii- کمپنی کے تمام اثاثے اور املاک صرف نقد رقم کی شکل میں نہ ہوں بلکہ کمپنی نے کچھ فکسڈ اثاثے حاصل کر لئے ہوں مثلاً بلڈنگ بنالی

ہو یا زمین خرید لی ہو۔

iii- اگر کمپنی سودی لین دین کرتی ہو تو اس کی سالانہ میٹنگ میں اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔

iv- جب منافع تقسیم ہوں تو نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہو اس کو صدقہ کر دے۔

ہمارا جواب

ہم کہتے ہیں کہ جس شرط فاسد اور جن مفاسد کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ان کی موجودگی میں مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی ذکر کردہ ان شرائط سے نہ تو فساد ختم ہوتا ہے اور نہ ہی جواز حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جب شیئر ہولڈر نے حصص خرید کر شرط فاسد کے ساتھ عقد اجارہ کیا تو وہ اجارہ فاسد ہو گیا۔ جائز شرائط کے ساتھ ایک بھی ناجائز شرط مل جائے تو اس سے عقد اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔

جہاں تک مولانا عثمانی مدظلہ کی ذکر کردہ تیسری شرط کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ عقد اجارہ تو شرط فاسد کی وجہ سے پہلے ہی فاسد ہو چکا اب محض اس کے خلاف آواز اٹھانے سے اور یوں کہنے سے کہ ''ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے، سودی لین دین پر راضی نہیں ہیں اس لئے اس کو بند کیا جائے''۔ فساد ختم نہیں ہو جائے گا۔

علاوہ ازیں کسی کام کی شرائط تو اس (مشروط) کام پر مقدم ہوتی ہیں۔ مولانا عثمانی نے جوازِ شراء (خرید کے جواز) کو مشروط اور آواز اٹھانے کو شرط قرار دیا ہے۔ خرید حصص جائز ہونے کے لئے شرط ہے کہ آواز اٹھائی جائے، اور چونکہ شرط مشروط سے مقدم ہوتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ خرید سے پہلے آواز اٹھائی جائے ورنہ خرید جائز

نہ ہوگی اور پہلے آواز اٹھائی نہیں جاسکتی، کیونکہ حصص کی خرید سے پہلے سالانہ اجلاس عام میں شمولیت اور احتجاج کرنے کی اجازت ہی حاصل نہ ہوگی اور خرید کے بعد احتجاج کرے تو خرید کے ساتھ جو اجارہ ہوا وہ شرط فاسد کی بنا پر فاسد ہو ہی چکا اور اجارہ فاسد کے بعد محض آواز اٹھانے سے جب کہ شرط فاسد بدستور قائم رہے فساد ختم نہیں ہوگا۔ تو یہ آواز اٹھانا عقد فاسد کے اعتبار سے محض بے فائدہ ہے۔

شیئرز کی خرید وفروخت میں مزید دو خرابیاں

1- سود دینے کی معصیت

پھر سود کے لینے میں تو مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے کہے کے مطابق حصہ دار یہ کر سکتا ہے کہ حاصل شدہ نفع میں سے سود کی مقدار صدقہ کر دے لیکن سود دینے سے وہ اپنے آپ کو کسی صورت میں نہیں بچا سکتا کیونکہ ڈائریکٹر جب کوئی قرض لیتے ہیں تو کمپنی کے نام پر لیتے ہیں خاص اپنی ذات کے لئے نہیں لیتے۔ اس قرض کا مالک کون بنا۔ تنہا ڈائریکٹر نہیں بنتے۔ کمپنی کو اگرچہ ایک Person کے طور پر لیا جاتا ہے لیکن وہ ایک معنوی چیز ہے جو ذمہ داری قبول نہیں کر سکتی۔ لہٰذا وہ قرض حصہ داروں کے درمیان ان کے سرمایے کے تناسب سے تقسیم ہوتا ہے۔ اس قرض کو اگر کاروبار میں لگایا تو نفع بھی اسی تناسب سے حصہ داروں کی ملکیت ہوگا۔ اسی نفع میں سے اس کی تقسیم سے پیشتر سود ادا کیا جاتا ہے۔ اور اگر کمپنی کو نقصان ہو گیا تو قرضہ کی واپسی بھی اور سود کی ادائیگی بھی حصہ داروں کے اصل سرمایہ میں سے کی جاتی ہے۔

غرض کمپنی جو سود کی ادائیگی کرے گی چونکہ وہ شیئر ہولڈر کی جانب سے ہوگی لہٰذا شیئر ہولڈر پر سود دینے کی معصیت بھی لازم آئے گی۔

2- خود معصیت سے نکلنے کے لئے دوسرے کو معصیت میں مبتلا کرنا

اگر کوئی شیئر ہولڈر یہ چاہے کہ ان خرابیوں سے بچنے کے لئے اپنے حصص واپس کر دے تو وہ کمپنی کو حصص واپس نہیں کر سکتا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اپنا عقد اجارہ کمپنی سے ختم نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے پاس فقط ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے حصص کسی اور کے ہاتھ فروخت کرے اور وہ خریدار کمپنی کے ڈائریکٹران کے ساتھ فاسد اجارہ کرے۔ گویا معصیت سے نکلنے کی بس یہی صورت ہے کہ کسی دوسرے کو اس معصیت میں مبتلا کر دے۔

مسئلہ:3

بازارحصص

(Stock Exchange)

تعارف وضرورت

(اس عنوان کے تحت مضمون مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب اسلام اور جدید معیشت وتجارت سے ماخوذ ہے)

جب کوئی شخص کمپنی کے شیئرز لے کر اس کا حصہ دار بن جائے تو اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی وقت وہ اپنی رقم واپس لے کر شرکت ختم کر سکے۔ بلکہ جب تک کمپنی وجود میں ہے، اس سے حصے کی رقم واپس نہیں لی جا سکتی لیکن چونکہ بہت سے شرکاء یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی شرکت ختم کر کے اپنے حصے کو نقد میں تبدیل کر لیں، اس لئے یہ ضمانت فراہم کرنا ضروری تھا کہ رقم لگانے کے بعد بوقت ضرورت اپنے شیئرز کو نقد میں تبدیل کرنا ممکن ہوگا، اس کے لئے ''بازارحصص'' قائم کیا گیا، جس میں شیئرز بیچے جا سکتے ہیں۔ یعنی کمپنی کے حصہ دار اپنی شرکت ختم کر کے کمپنی سے تو اپنا سرمایہ واپس نہیں لے سکتے لیکن بازارحصص میں وہ اپنا حصہ کسی اور کو بیچ سکتے ہیں جس کے نتیجے میں خریدار ان کی جگہ کمپنی کا حصہ دار بن جاتا ہے جس جگہ شیئرز کی خرید وفروخت

ہوتی ہے اس کو بازار حصص (Stock Market) کہتے ہیں۔

شیئرز کی خرید وفروخت کے دو طریقے ہیں۔ایک یہ کہ دو شخص کسی ادارے کے توسط کے بغیر شیئرز کی خرید وفروخت کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی ادارے کے توسط سے شیئرز کی خرید وفروخت ہو۔ وہ ادارہ اسٹاک ایکسچینج ہے جو شیئرز کی خرید و فروخت کی نگرانی بھی کرتا ہے اور واسطہ بھی بنتا ہے۔اسٹاک ایکسچینج کے توسط کے بغیر جو شیئرز کا کاروبار ہوتا ہے اسے (Over The Counter Transactions) کہتے ہیں۔اس انداز کی خرید وفروخت کا کوئی خاص نظم نہیں، البتہ جو خرید وفروخت اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے ہوتی ہے اس کی کچھ تفصیل یہ ہے:

اسٹاک ایکسچینج ایک پرائیویٹ ادارہ ہوتا ہے۔ جو حکومت کی اجازت وسرپرستی کے ساتھ کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت کا کام کرتا ہے۔لیکن اسٹاک ایکسچینج انہی کمپنیوں کے شیئرز کا کاروبار کرتا ہے جو قابل اعتماد ہوں اور کچھ نہ کچھ ساکھ رکھتی ہوں۔جن کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے ان کو (Listed Companies) کہتے ہیں۔ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت اسٹاک ایکسچینج میں بھی ہوسکتی ہے اور ''اوور دی کاؤنٹر'' بھی ہوسکتی ہے۔ کسی کمپنی کی لسٹنگ کبھی اس کے وجود میں آجانے کے بعد ہوتی ہے۔کبھی کمپنی منظور ہونے کے بعد اس کے کاروبار شروع ہونے سے پہلے، بلکہ کبھی شیئرز فلوٹ ہونے سے بھی پہلے کمپنی کی لسٹنگ ہو جاتی ہے اس کو عبوری (Provisional) لسٹنگ کہتے ہیں۔ اس کا کاؤنٹر بھی الگ ہوتا ہے۔جن کمپنیوں کے شیئرز اسٹاک ایکسچینج نہیں لیتا ہے ان کو (Unlisted Companies) کہتے ہیں۔ ان کے شیئرز کی خرید وفروخت ''اوور دی کاؤنٹر'' ہی ہوسکتی ہے اسٹاک ایکسچینج میں نہیں ہوسکتی۔

ممبر شپ

اسٹاک ایکسچینج میں ہر شخص شیئرز کی خرید وفروخت کا کام نہیں کر سکتا اس کے لئے ممبر ہونا ضروری ہے، ممبر شپ کی فیس بھی ہوتی ہے۔ممبر ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کا کاروبار بہت وسیع، نازک اور فنی نوعیت کا ہوتا ہے۔وہاں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ایک نیا ناتجربہ کار شخص کاروبار میں غلطی بھی کر سکتا ہے اور ادارہ وہاں ہونے والے تمام معاملات میں ادائیگیوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔لہٰذا ادارہ ہر شخص کو خرید وفروخت کی اجازت دے کر اس کے معاملہ کا ذمہ دار نہیں بننا چاہتا، اس لئے ممبر ہونا ضروری قرار دیدیا گیا ہے۔

اسٹاک ایکسچینج میں دلالی

اسٹاک ایکسچینج کے ممبر اپنے لئے بھی شیئرز خریدتے ہیں اور بحیثیت دلال کمیشن لے کر دوسروں کے لئے بھی خریدتے ہیں۔غیر ممبر کو شیئرز خریدنے ہوں تو وہ کسی دلال کے واسطے سے خریدتا ہے۔شیئرز خریدنے کے لئے دلال کو آرڈر دینے کی یہ صورتیں ہیں۔

1- مارکیٹ آرڈر(Market Order): یعنی ایسا آرڈر جس میں دلال سے یہ کہہ دیا گیا ہو کہ مارکیٹ میں جو بھی ریٹ ہو اس پر فلاں کمپنی کے شیئرز خرید لئے جائیں۔

2- لمیٹڈ آرڈر(Limited Order): یعنی ایک قیمت مقرر کر کے آرڈر دیا جائے کہ اگر اس قیمت پر شیئرز مل جائیں تو لے لئے جائیں، اس سے زیادہ قیمت پر نہ خریدے جائیں۔

شیئرز کی قیمتوں کا تعین

کمپنیوں کے شیئرز کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔اس میں کمپنی کے اثاثوں کو بھی دخل ہوتا ہے۔اثاثے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے،لیکن اثاثوں کے علاوہ اور کئی خارجی عوامل سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں،مثلاً منافع کے امکانات، طلب و رسد کا رجحان، سیاسی حالات، موسمی حالات، غیر مادی عوامل جیسے بعض افواہوں اور تخمینوں سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ چونکہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ میں خارجی عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اس لئے شیئرز کی قیمتوں سے کمپنی کے اثاثوں کی حقیقی نمائندگی نہیں ہوتی۔

خریدار حصص کی قسمیں

شیئرز خریدنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔

1- بعض لوگ کمپنی میں حصہ دار بننے کے لئے شیئر خریدتے ہیں اور شیئر اپنے پاس رکھ کر سالانہ نفع حاصل کرتے ہیں،مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

2-اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شیئرز کو بذات خود مال تجارت سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کرتے ہیں، جب شیئرز کی قیمت کم ہو اس وقت خریدتے ہیں اور جب قیمت بڑھ جائے تو بیچ دیتے ہیں۔ دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ ان کا نفع ہوتا ہے۔ قیمتوں کے بڑھنے کی وجہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کو کیپیٹل گین (Capital Gain) کہتے ہیں۔اس کاروبار میں پہلے تخمینہ اور اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ کونسے شیئرز کی قیمتیں آئندہ کم ہوں گی اور کونسے شیئرز کی قیمتیں بڑھیں گی،اس عمل تخمین کو (Speculation) کہتے ہیں۔ یہ اندازہ کبھی صحیح ثابت ہوتا ہے اور کبھی غلط۔

شیئرز کی خرید وفروخت کا طریق کار

شیئرز کی خریداری کے تین طریقے ہیں۔

1- حاضر سودا:(Spot Sale) یہ خرید وفروخت کا عام سادہ انداز ہے کہ کسی نے شیئرز خرید کران کی پوری قیمت ادا کر دی۔اس حاضر سودے میں بھی شیئرز کے سر ٹیفکیٹ پر قبضہ عموماً ایک ہفتے کے بعد ہوتا ہے۔

2-(Sale on margin): اس سے مراد شیئرز کی ایسی خریداری ہے جس میں شیئرز کی قیمت کا کچھ فیصد حصہ فی الحال ادا کر دیا جائے۔ باقی ادھار ہو۔مثلاً دس فیصد قیمت ادا کر دی اور 90 فیصد ادھار ہے۔اس کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اکثر شیئرز خریدتے رہتے ہیں ان کے دلالوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔اب کوئی شخص دلال سے کہتا ہے کہ فلاں کمپنی کے شیئرز Margin پر خریدلو،جس کی شرح طے کر لی جاتی ہے مثلاً دس فیصد،اتنی رقم تو خریدار دیدیتا ہے، باقی 90 فیصد دلال اپنی طرف سے ادا کرتا ہے۔ یہ رقم دلال کا قرض ہوتا ہے خریدار کے ذمے۔ دلال کبھی اس پر سود لیتا ہے اور کبھی نہیں۔اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ چند دن تک تو مہلت بلا سود ہے،اس کے بعد سود ادا کرنا ضروری ہوتا ہے مثلاً اگر باقی ماندہ قیمت تین دن تک ادا کر دی تو سود نہیں ہوگا۔لیکن اس کے بعد سود لگے گا۔اس میں دلال کا اصل فائدہ کمیشن ہوتا ہے۔اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لئے اور کمیشن لینے کے لئے وہ قرض دینے کو بھی تیار ہوتا ہے۔

3- (Short Sale): شارٹ سیل درحقیقت ''بیع غیر مملوک'' کا نام ہے، یعنی بائع ایسے شیئرز فروخت کر دیتا ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں ہوتے۔لیکن اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ سودا ہو جانے کے بعد میں یہ شیئرز لیکر خریدار کو دیدونگا۔

حاضر اور غائب سودے

شیئرز کے سودے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کو حاضر سودا (Spot Sale) کہتے ہیں اور دوسرے کو غائب سودا (Forward Sale) کہتے ہیں۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ابھی ہو جاتی ہے اور حقوق کی منتقلی بھی ابھی ہو جاتی ہے۔ خریدار ابھی سے شیئرز لینے کا حقدار ہوتا ہے، مگر بعض انتظامی مجبوریوں کی بناء پر شیئرز کے سرٹیفکیٹ کی ادائیگی (ڈیلیوری) میں تاخیر ہوتی ہے۔ عموماً ایک سے تین ہفتوں تک تاخیر ہو جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ تاخیر رجسٹرڈ شیئرز کی ادائیگی میں ہوتی ہے، جن پر حامل کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔ حامل کا نام بدلنے کے لئے کمپنی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ سے تاخیر ہو جاتی ہے۔ بیئرر شیئرز میں زیادہ تاخیر نہیں ہوتی ہے...... حاضر سودے میں بھی چونکہ شیئرز پر قبضہ ہونے میں تاخیر ہو جاتی ہے، اس لئے یہاں بھی خریدار شیئرز کے سرٹیفکیٹ کو اپنی تحویل میں لینے سے پہلے آگے بیچ دیتا ہے۔ بسا اوقات قبضے کا وقت آنے پر اس کی کئی ہاتھوں میں بیع ہو چکی ہوتی ہے۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ہو جانے کے بعد قبضے سے پہلے اگر کمپنی نفع تقسیم کر دے تو کمپنی نفع بائع کے نام ہی جاری کرتی ہے، لیکن طریق کار یہی ہے کہ چونکہ بیع ہونے کے بعد نفع تقسیم ہوا ہے، اس لئے بائع وہ نفع خریدار کو دیدیتا ہے۔

غائب سودے میں بیع تو ابھی ہو جاتی ہے، مگر مستقبل کی طرف مضاف ہوتی ہے۔ جیسے ابھی شیئرز کی بیع ہو چکی ہے، مگر قبضے وغیرہ کے حقوق فلاں تاریخ سے متعلق ہوں گے۔ غائب سودے میں جب وہ تاریخ آتی ہے جس پر شیئرز کی ادائیگی طے کی گئی تھی تو بعض اوقات شیئرز خریدار کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بائع اور خریدار شیئرز لینے کے بجائے خریداری کی تاریخ کی قیمت اور

ادائیگی کی تاریخ کی قیمت کا فرق آپس میں برابر کر لیتے ہیں۔مثلاً یکم جنوری کو 30 مارچ کی تاریخ کیلئے غائب سودا کیا گیا تھا، اور فی شیئر دس روپے قیمت مقرر ہوئی تھی۔لیکن جب 30 مارچ کی تاریخ آئی تو شیئرز کی قیمت بڑھ کر بارہ روپے ہوگئی۔ اب بائع خریدار کو شیئرز دینے کے بجائے دو روپے فی شیئر ادا کر دیتا ہے، یا اگر قیمت آٹھ روپے رہ گئی تو خریدار بجائے اس کہ بائع کو دس روپے دیکر اس سے شیئرز وصول کرے، اسے فی شیئر دو روپے دیدیتا ہے اور شیئرز وصول نہیں کرتا۔ پھر غائب سودے میں سودے کی تاریخ کے بعد ادائیگی کی تاریخ آنے تک بعض اوقات بہت سے سودے ہوجاتے ہیں۔یعنی پہلا خریدار دوسرے کو، دوسرا تیسرے کو بیچتا رہتا ہے۔اور بعض اوقات آخر میں سب شیئرز کے لین دین کے بجائے قیمتوں کا فرق برابر کر لیتے ہیں۔

اجناس میں حاضر اور غائب سودے

بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے جیسے شیئرز کے حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں ایسے ہی اجناس اور اشیاء کے بھی حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں۔ یہ سودے چند منتخب بڑی بڑی اجناس میں ہوتے ہیں مثلاً گندم، کپاس وغیرہ۔

اجناس کا حاضر سودا تو یہ ہوتا ہے کہ کسی جنس کی ابھی بیع ہوئی اور حقوق بھی منتقل ہوگئے اور خریدار ابھی سے قبضے کا حقدار قرار پایا۔کسی انتظامی مجبوری کی بناء پر قبضے میں تاخیر ہوتو وہ الگ بات ہے، مگر وہ حقدار قبضے کا بن چکا ہے۔

غائب سودا یہ ہے کہ بیعانہ دے کر بیع تو ہوگئی، مگر قبضے کے لئے کوئی آئندہ تاریخ مقرر ہوجاتی ہے، اس کی تفصیل ایک کمپنی Empire Resources کے مطابق یہ ہے کہ دلچسپی رکھنے والا شخص اس کمپنی کی شاخ میں دس ہزار ڈالر جمع کرا کے سکیم کا رکن

بن جاتا ہے۔ پھر وہ کمپنی کو اپنا آرڈر دیتا ہے تو کمپنی ان جمع شدہ دس ہزار ڈالر میں سے دو ہزار ڈالر بطور بیعانہ یا تحفظ (Security) کے مختص کر لیتی ہے اور آرڈر کو اپنے مرکزی دفتر پہنچا دیتی ہے جو دنیا کے کسی تجارتی مرکز میں موجود دلال سے آرڈر کی تکمیل کر کے خریداری کی اطلاع دیتا ہے۔ اصولی طور پر اس کو (Forward Sale) بھی کہتے ہیں اور (Future Sale) بھی کہتے ہیں۔ مگر آج کل عملی طور پر ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ غائب سودے میں اگر جانبین کا مقصد مقررہ تاریخ پر لینا، دینا ہی ہو یعنی مشتری کا مقصد جنس وصول کرنا اور بائع کا مقصد قیمت لینا ہو تو اس کو (Forward Sale) کہتے ہیں اور اگر جانبین کا مقصد مقررہ تاریخ پر لینا، دینا نہ ہو بلکہ جنس کو محض معاملے کی بنیاد کی حیثیت سے اختیار کیا گیا ہو اس کو (Future Sale) کہتے ہیں۔ اور عربی میں اس کو ''مستقبلیات'' کہتے ہیں۔ اس میں جنس کا لینا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ مقصد دو باتوں میں سے ایک بات ہوتی ہے۔

1- سٹہ: (Speculation) تاریخ مقررہ پر جنس لینے، دینے کی بجائے قیمتوں کا فرق برابر کر کے نفع کمایا جاتا ہے۔ مثلاً یکم دسمبر کو یہ معاملہ طے ہوا کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں ایک لاکھ روپے میں دینی ہوں گی، مگر نہ بائع کا مقصد کپاس دینا ہوتا ہے اور نہ مشتری کا مقصد کپاس لینا ہوتا ہے، بلکہ تاریخ آنے پر دونوں آپس میں نفع یا نقصان برابر کر لیتے ہیں۔ اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت ایک لاکھ دس ہزار ہو گئی تو بائع مشتری کو دس ہزار دے کر معاملہ صاف کر لے گا۔ اور اگر یکم جنوری کو قیمت 90 ہزار ہو گئی تو بائع مشتری سے دس ہزار لے کر معاملہ صاف کر لے گا۔

2- (Future Sale) کا دوسرا مقصد ممکنہ نقصان سے تحفظ ہوتا ہے۔ اس کو Hedging کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی جنس کا غائب سودا (Forward Sale) کرتا ہے اور اس کا مقصد واقعی جنس وصول کرنا ہی ہوتا ہے،

سٹہ مقصود نہیں ہوتا۔لیکن خریدار یہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ تک اس جنس کی قیمت گر گئی تو مجھے نقصان ہوگا وہ اس نقصان سے بچنے کے لئے اسی جنس کو (Futures market) میں اسی تاریخ کے لئے (Future) پر فروخت کرتا ہے ،تا کہ اگر اس جنس کی قیمت گر گئی تو پہلے معاملے میں جتنا نقصان ہوگا اتنا ہی دوسرے معاملے میں وصول ہو جائے گا۔

مثلاً زید نے یکم دسمبر کو کپاس کی سو گانٹھ ایک لاکھ روپے میں خریدیں، قبضہ یکم جنوری کو طے ہوا،۔اس کا خیال یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں لے کر آگے بیچ کر نفع کماؤں گا،مگر خطرہ یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی قیمت گر گئی تو اس کو نقصان ہوگا۔زید اس نقصان سے بچنے کے لئے یہ کارروائی کرتا ہے کہ کپاس کی سو گانٹھیں یکم جنوری تک ایک لاکھ روپے میں (Futures) مارکیٹ میں خالد کو بیچ دیتا ہے۔اب اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت 90 ہزار ہوگئی تو زید کو دس ہزار کا خسارہ ہوا۔مگر اتنی ہی گانٹھیں چونکہ اس نے خالد کو (Futures) کے بازار میں بیچی ہوئی ہیں،اس لئے یکم جنوری کو وہ 90 ہزار میں دوسری گانٹھیں خرید کر خالد کو ایک لاکھ میں فروخت کر دیگا اور اس طرح پہلے معاملے میں زید کو جو دس ہزار کا خسارہ ہوا تھا وہ اس نے خالد کے ساتھ کئے ہوئے معاملے سے وصول کر لیا......''فیوچر سیلز'' اس طرح نقصان سے بچنے کے لئے بھی ہوتی ہے،اسی کو Hedging (ہے جنگ) کہتے ہیں۔

(Futures) وغیرہ کا کاروبار بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج ہی میں ہوتا ہے اور بعض ممالک میں اس کا الگ بازار ہوتا ہے۔

مالیاتی منڈی (Financial Market)

اسٹاک ایکسچینج ایک بڑے بازار کا حصہ ہے جس کو مالیاتی منڈی Financial

Market یا Capital Market کہتے ہیں جس میں صرف کمپنیوں کے شیئرز ہی نہیں، بلکہ دوسرے اداروں (بینک، دیگر مالیاتی ادارے حکومت وغیرہ) کی جاری کردہ مالیاتی دستاویزات کی خرید وفروخت بھی ہوتی ہے۔ گواس بازار کا کوئی الگ جغرافیائی وجود ضروری نہیں، عملاً یہ سب کام اسٹاک ایکسچینج میں ہی ہو سکتے ہیں، مگر اصطلاح میں اس کا معنوی تصور ہے۔ اسی Financial Market میں ''سرکاری تمسکات'' (Government Securities) کی بیع وشراء بھی ہوتی ہے۔ ''سرکاری تمسکات'' ان دستاویزات کو کہتے ہیں جو حکومت وقتاً فوقتاً عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے۔ جب حکومت کے ذرائع آمدنی (ٹیکس وغیرہ) بجٹ کے لئے ناکافی ہوں، تو حکومت یہ مالیاتی دستاویز عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے۔ مثلاً

1-......انعامی بانڈ۔ جس میں ہر بانڈ پر تو نفع نہیں ہوتا، تمام بانڈز سے حاصل ہونے والی رقوم پر مجموعی طور پر نفع ہوتا ہے جو قرعہ اندازی سے تقسیم ہوتا ہے۔

2-......ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

3-......خاص ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ

4-فارن ایکسچینج سرٹیفکیٹ

لوگوں سے فارن ایکسچینج بطور قرض لینے کے لئے جو دستاویز حکومت نے جاری کی اس کو فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ (F.E.B.C) کہتے ہیں......اس کی شکل یہ ہے کہ حکومت ڈالر لے کر اس وقت کی قیمت کے مطابق پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیتی ہے مثلاً اس وقت ڈالر کی قیمت 65 روپے ہے اور باہر سے آنے والا سو ڈالر لے کر آیا تو حکومت اس سے سو ڈالر لے کر اس کو چھ ہزار پانچ سو پاکستانی

روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کرے گی، جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت حامل سرٹیفکیٹ کے لئے پاکستانی ساڑھے چھ ہزار روپوں کی مقروض ہے۔

ایف ای بی سی پر سالانہ 12 فیصد اضافہ ملتا ہے اور اس کا حامل جب چاہے یہ سرٹیفکیٹ پیش کر کے دوبارہ ڈالر لے سکتا ہے۔ اور حامل اس سرٹیفکیٹ کو بیچ بھی سکتا ہے۔

یہ تمام سرکاری تمسکات ہیں ان میں اصل معاملہ تو حکومت اور قرض دہندہ (حامل دستاویز) کے درمیان ہوتا ہے، لیکن عوام کی سہولت کے لئے ان کے بیچنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ (Financial Market) میں ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ حامل دستاویز جب اس کی بیع کرے گا تو اب وہ دائن نہیں رہے گا، اس کا معاملہ حکومت سے ختم ہو جائے گا اور اب خریدار دائن ہوگا اور حکومت کا معاملہ خریدار سے وابستہ ہو جائے گا۔

5-ٹریژری بل

تجارتی بینکوں سے قرض وصول کرنے کیلئے مرکزی بینک(State Bank) ایک بل جاری کرتا ہے جس کو انگریزی میں (Treasury Bill) ٹریژری بل کہا جاتا ہے۔ ایک بل پر لکھی ہوئی قیمت (Face value) سو روپے ہوتی ہے۔

یہ بل مقررہ مدت کیلئے جاری ہوتے ہیں جو عموماً چھ ماہ ہوتی ہے۔ یہ بل بذریعہ نیلام بیچے جاتے ہیں اور ان کے ابتدائی خریدار صرف تجارتی بینک ہی ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ کبھی بینکوں سے خرید لیتے ہیں۔ نیلام کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرکزی بینک اعلان کر دیتا ہے کہ اتنی رقم (مثلاً دس ارب) کے ٹریژری بل جاری کئے جا رہے ہیں اور بینک اپنی اپنی طلب بتاتے ہیں۔ ہر بینک بتاتا ہے کہ میں اتنی قیمت پر اتنے بل

خریدنا چاہتا ہوں آج کل اس کا ریٹ عموماً 13 تا 14 فیصد ہے یعنی سو روپے کا بل عموماً 86 یا 87 روپے میں فروخت ہوتا ہے۔ جس جس بینک کی بولی قبول ہوتی ہے اس کو اس کی طلب کے مطابق بل دے کر رقم اس سے وصول کر لی جاتی ہے۔ اب جس بینک نے یہ بل مثلاً 86 روپے میں خریدا وہ چھ ماہ کے بعد اس کے پورے سو روپے وصول کرلے گا اور چودہ روپے اس کے سود یا نفع کے ہوں گے۔ اس بل کی مدت آنے سے پہلے سٹیٹ بینک ہی یا بازار حصص (Stock Exchange) میں اس بل پر ہنڈی کی طرح بٹہ بھی لگایا جا سکتا ہے یعنی اس کی ڈسکاؤنٹنگ بھی ہو سکتی ہے۔

شیئرز یا قرضے کی دستاویزات جہاں ان کے جاری کنندہ کے بجائے کسی تیسرے شخص کو فروخت کی جائیں اس بازار کو ثانوی بازار (Secondary Market) کہا جاتا ہے۔ جن دستاویزات کا کوئی ثانوی بازار ہو یعنی وہ کسی تیسرے فریق کو فروخت کی جا سکتی ہوں ان کو زیادہ پرکشش سمجھا جاتا ہے اور لوگ روپے کے عوض یہ دستاویزات لینے میں اس لئے دلچسپی رکھتے ہیں کہ جب چاہیں گے انہیں ثانوی بازار میں فروخت کر کے نقد رقم حاصل کر لیں گے۔

بازار حصص (سٹاک ایکسچینج)
میں دلالی کے کام کی شرعی حیثیت

بازار حصص میں جس قسم کے کام ہوتے ہیں اور دلال جو کام کرتے ہیں ان کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت کی رو سے یہ جائز نہیں اس کی کچھ تفصیل یہ ہے:

1- شیئرز کی خرید و فروخت میں خرابیاں

پیچھے ہم بتا چکے ہیں کہ کمپنی کے کام میں چند بڑی خرابیاں ہیں۔

i- ڈائریکٹران کو سود پر لین دین کرنے کا حق ہوتا ہے۔

ii- ڈائریکٹران کے بھتے جو ان کی تنخواہ ہی کا حصہ ہوتے ہیں وہ مجہول ہوتے ہیں اور ان کی جہالت اتنی معمولی نہیں ہوتی کہ نظر انداز کی جا سکے۔ ان دو خرابیوں کی وجہ سے کمپنی کے ڈائریکٹران اور دیگر حاملین حصص کے درمیان معاملہ جس کی حقیقت اجارہ ہے فاسد ہو جاتی ہے۔

iii- مذکورہ بالا دو خرابیوں کا ادراک کر کے اب اگر کوئی حامل حصص ان سے بچنا چاہے تو وہ اپنے حصص کمپنی کو واپس نہیں کر سکتا اور اس کے پاس صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنے حصص کسی اور کے ہاتھ فروخت کرے اور اس کے ضمن میں وہ خریدار کمپنی کے ڈائریکٹران کے ساتھ فاسد اجارہ کرے۔ غرض معصیت سے نکلنے کی بس یہی صورت ہے کہ کسی دوسرے کو اس معصیت میں مبتلا کر دیا جائے۔

iv- کمپنی کے ڈائریکٹران اور حاملین حصص محدود ذمہ داری کے حامل ہوتے ہیں۔محدود ذمہ داری کا تصور غیر شرعی ہے جیسا کہ ہم نے پیچھے تفصیل سے بتایا ہے۔

v- نقصان کی صورت میں حامل حصص کو سودا ادا کرنا پڑتا ہے۔اس کی تفصیل بھی پیچھے گزر چکی ہے۔

2- سٹہ بازی

سٹہ بازی سٹاک ایکسچینج کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے جس میں بسا اوقات شیئرز کا لین دین بالکل مقصود نہیں ہوتا بلکہ آخر میں جا کر آپس کا فرق (Difference) برابر کرلیا جاتا ہے مثلاً زید نے ایک ہزار کے سو شیئرز خریدنے کا سودا کیا۔اس کا شیئرز پر قبضہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے بس یہ مقصد ہے کہ مثلاً پندرہ دن بعد قیمت کو دیکھیں گے اور اس میں جو کمی بیشی ہوگی اس کا حساب کرلیں گے اس لئے زید خریدے ہوئے شیئرز کی قیمت بھی ادا نہیں کرتا۔پھر پندرہ دن بعد اگر قیمت ایک ہزار ایک سو ہوگئی تو زید فروخت کنندہ سے سو روپے لے لے گا اور اگر قیمت گر کر نو سو ہوگئی تو زید اس کو سو روپے دے گا۔

اسی طرح کا سٹہ سٹاک ایکسچینج یا کسی دوسرے بازار کے ذریعہ سونے چاندی، کرنسی اور دیگر اجناس میں بھی ہوتا ہے۔ایسے سودے کو جس میں سامان پر قبضہ کیلئے کوئی آئندہ تاریخ مقرر ہو جاتی ہے انگریزی میں future sale کہتے ہیں۔اس میں عام طور سے جنس کا لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ قبضہ کی تاریخ سے پیشتر ہی اس تاریخ پر بائع کے ہاتھ سودا واپس بیچ دیا جاتا ہے اور نفع یا نقصان برابر کرلیا جاتا ہے۔مثلاً یکم دسمبر کو معاملہ طے ہوا کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں ایک لاکھ روپے کے عوض دینی ہوں گی۔سودے کی واپس فروخت کے وقت اگر قیمت ایک لاکھ دس ہزار ہوگئی تو

خریدار سامان والے سے دس ہزار روپے لے کر معاملہ صاف کر لے گا اور اگر اس وقت قیمت نوے ہزار ہو گئی تو خریدار سامان والے کو دس ہزار دے کر معاملہ صاف کر لے گا۔

سٹہ میں خرابیاں

i- اگر خریدار اسی بائع کے ہاتھ سودا واپس فروخت کرتا ہے اور قیمت گھٹ کر نوے ہزار ہو جاتی ہے اور خریدار نے سامان کی قیمت کی پوری ادائیگی بھی نہیں کی تھی بلکہ محض ٹوکن کے طور پر کچھ حصہ دیا تھا تو یہ سود کی صورت بنی کیونکہ بائع کو اپنا سامان بھی واپس ملا اور ساتھ میں دس ہزار روپے زائد بھی ملے۔

عن امرأة ابی سفیان قالت سألت عائشة فقلت بعت زید بن ارقم جاریة الی العطاء بثمانمأة و ابتعتها منه بستمائة فقالت عائشة رضی الله عنها بئس والله ما اشتریت ابلغی زید بن ارقم انه قد ابطل جهاده مع رسول الله ﷺ الا ان یتوب. (عبدالرزاق)

حضرت ابوسفیانؓ کی اہلیہ کہتی ہیں میں نے حضرت عائشہؓ سے (جائز ناجائز معلوم کرنے کے لئے) کہا کہ میں نے (اپنی) ایک باندی سرکاری وظیفہ ملنے (کے وقت) تک (ادھار پر) آٹھ سو درہم کے عوض زید بن ارقمؓ کے ہاتھ فروخت کی۔ پھر اسی باندی کو میں نے (قیمت کی وصولی سے پہلے) چھ سو درہم میں ان سے خرید لیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گویا چھ سو قرض دے کر میعاد مقررہ پر آٹھ سو درہم کی مستحق ہو گئی۔ باندی بھی واپس ملی اور دو سو درہم کا نفع بھی ہوا)۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا خدا کی قسم تم نے نہایت برا معاملہ کیا ہے۔ زید بن ارقم کو (میرا یہ پیغام) پہنچا دو کہ انہوں نے (یہ سودی معاملہ کر کے) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا جہاد ضائع کر دیا الا یہ کہ وہ

توبہ کرلیں۔

ii- سونے چاندی یا کرنسی کی خرید کی صورت میں ان کا تو ادھار ہوتا ہی ہے قیمت کی بھی مکمل ادائیگی نہیں کی گئی حالانکہ سونے چاندی اور کرنسی کی ادھار خرید وفروخت میں یہ شرط ہے کہ ایک جانب سے مکمل قبضہ ہو جائے۔

سئل الحانوتی عن بیع الذھب بالفلوس نسیئة فاجاب بانه یجوز اذا قبض احد البدلین (رد المحتار).

علامہ حانوتیؒ سے فلوس (مثلاً روپے) کے عوض سونے کی ادھار فروخت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر دو عوضوں میں سے ایک پر قبضہ کر لیا گیا ہو تو جائز ہے۔

iii- سامان (Commodities) میں غلہ بھی ہوتا ہے جبکہ غلہ پر قبضہ کئے بغیر اس کو آگے فروخت کرنا بالاتفاق ناجائز ہے۔

عن عبدالله بن عمر ان رسول الله ﷺ قال من اشتری طعاما فلا یبعه حتی یستوفیه و یقبضه. (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے غلہ خریدا تو وہ اس کو فروخت نہ کرے جب تک اس کو پورا وصول نہ کرلے اور اس پر قبضہ نہ کرلے۔

iv- Future Sale میں قیمت پوری کی پوری مجلس عقد میں دینی ہوتی ہے۔ یہ شرط بھی پوری نہیں ہوئی۔ حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی عَنْ بَیْعِ الْکَالِیِٔ بِالْکَالِیِٔ. (دار قطنی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

نبی ﷺ نے ادھار کے عوض ادھار کی بیع سے منع فرمایا (چونکہ فارورڈ سیل یعنی بیع سلم میں سودا ادھار ہوتا ہے اس لئے ممنوعہ بیع سے بچنے کے لئے مجلس بیع ہی میں کل قیمت کی ادائیگی ضروری ہے)۔

v- Future Sale میں جو لاٹ خریدی اگر وہ خریداری کے دن ہی فروخت کردی گئی تو دلال یا دلالی کرنے والی کمپنی صرف اپنا کمیشن وصول کرتی ہے اور اگر فروخت میں کچھ دن لگ گئے تو یومیہ کے حساب سے وہ سود بھی وصول کرتی ہے۔ بعض صورتوں میں خود مؤکل کو سود ملتا ہے۔ Empire Resources نے اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

Interest/Premium are paid or charged basing on the number of days for a position trade.

vi- فقہ کا قاعدہ ہے کہ **الامور بمقاصد ھا**

چونکہ کمپنی کے اثاثہ جات میں شرکت مقصود ہی نہیں تو معلوم ہوا کہ محض سٹہ بازی اور جوا ہے کہ جب شیئرز کے کاروبار میں قیمت بڑھ گئی تو جیت گئے اور قیمت گر گئی تو ہار گئے۔

3- سٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی بدلہ کے نام سے خرید و فروخت

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو پیسوں کی ضرورت ہے اور اس کے پاس کچھ شیئرز موجود ہیں۔ وہ شخص دوسرے کے پاس وہ شیئرز لے کر جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں یہ شیئرز تمہارے ہاتھ آج اتنی قیمت پر بیچتا ہوں اور ایک ہفتے کے بعد میں قیمت بڑھا کر تم سے اتنے میں خرید لوں گا۔

خرابیاں

i- یہ مقصد کے اعتبار سے قرض ہے اسی لئے شیئر کی اصل قیمت اگر چہ گر بھی جائے تب بھی وہ زائد قیمت پر ہی خریدے گا۔ اور جب اس کی حقیقت قرض ہے تو زائد قیمت جو شیئر والا دوسرے کو دے گا وہ سود ہوگا۔

ii- شیئرز کی خرید وفروخت کی جو خرابیاں اوپر ذکر ہوئیں وہ یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔

4- Margin پر شیئرز کی خرید

اس سے مراد شیئرز کی ایسی خریداری ہے جس میں شیئرز کی قیمت کا کچھ فیصد فی الحال ادا کر دیا جائے باقی ادھار ہو مثلاً دس فیصد قیمت ادا کر دی اور نوے فیصد ادھار ہے۔ اس کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اکثر شیئرز خریدتے رہتے ہیں ان کے دلالوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ اب کوئی شخص دلال سے کہتا ہے کہ فلاں کمپنی کے شیئرز مارجن (Margin) پر خریدلو جس کی شرح طے کر لی جاتی ہے مثلاً دس فیصد، اتنی رقم تو خریدار دے دیتا ہے باقی نوے فیصد دلال اپنی طرف سے ادا کرتا ہے۔ یہ رقم دلال کی جانب سے قرض ہوتی ہے جو خریدار کے ذمے ہوتی ہے۔ دلال کبھی اس پر سود لیتا ہے اور کبھی نہیں۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ چند دن تک تو مہلت بلا سود ہے اس کے بعد سود ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

خرابیاں

i- دلال اگر سود لیتا ہے تو سود کی خرابی ہوئی۔

ii- شیئرز کی خرید وفروخت کی مذکورہ بالا خرابیاں بھی شامل ہیں۔

5- غیر مملوکہ شیئرز کی فروخت

اس کو انگریزی میں Short Sale کہتے ہیں۔ بائع ایسے شیئرز فروخت کرتا ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں ہوتے لیکن اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ سودا ہو جانے کے بعد میں یہ شیئرز لے کر خریدار کو دے دوں گا۔

خرابیاں

i- غیر مملوکہ چیز کی بیع شرعا باطل ہوتی ہے۔

ii- شیئرز کی خرید و فروخت کی مذکورہ بالا خرابیاں۔

6- سرکاری تمسکات پر بٹہ لگانا

مثلاً ٹریژری بل پر بٹہ لگانا اور ایف ای بی سی کو کم و بیش قیمت پر خرید و فروخت کرنا سود میں شامل ہے۔

حاصل کلام

یہ ہے کہ سٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں بہت سی خرابیاں ہیں اور بعض خرابیاں ایسی ہیں جن سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لہٰذا سٹاک ایکسچینج میں رکنیت حاصل کرنا اور دلالی کرنا شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے۔

مسئلہ:4

کیا تکافل کا نظام اسلامی ہے؟

ہمارے ہاں تکافل یعنی اسلامی انشورنس کا جو نظام رائج کیا گیا ہے وہ مولانا تقی عثمانی مدظلہ کا وضع کیا ہوا ہے اور وقف اور اس کے چار قواعد پر مبنی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

ومن هنا ظهرت الحاجة الى ان تكون هذه المحفظة على اساس الوقف فان الوقف له شخصية اعتبارية فى كل من الشريعة والقانون

اس سے یہ ضرورت ظاہر ہوئی کہ انشورنس کا فنڈ وقف کی بنیاد پر ہونا چاہیئے کیونکہ وقف کو قانون وشریعت دونوں میں قانونی واعتباری شخصیت حاصل ہے۔

وقف کے چار قواعد یہ ہیں:

1- نقدی (روپے) کا وقف درست ہے۔

2- واقف اپنے کیئے ہوئے وقف سے خود نفع اٹھا سکتا ہے۔

3- وقف کو جو تبرع یعنی چندہ کیا جائے وہ وقف کی ملکیت بنتا ہے خود وقف نہیں بنتا۔

4- وقف کیلیئے ناگزیر ہے کہ وہ بالآخر ایسی مد کیلیئے ہو جو کبھی ختم نہ ہو مثلاً فقراء کیلیئے ہو۔

وقف کے ان چار قواعد پر مبنی نظام تکافل کی تفصیلی شکل یہ ہے

(نوٹ: عربی عبارت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے رسالہ تاصیل التامین التکافلی علی اساس الوقف والحاجة الداعیة الیه کی ہے)۔

1- تکافل یا اسلامی انشورنس کمپنی اپنے سرمایہ کے ایک حصہ سے وقف کا ایک فنڈ قائم کرتی ہے۔ جو اولا تو فنڈ میں شریک ان لوگوں کیلئے ہوگا جو فنڈ کی شرائط کے مطابق کسی حادثاتی نقصان کا شکار ہوئے ہوں اور بالآخر نیکی کے ختم نہ ہونے والے کاموں کیلئے ہوگا۔ فنڈ کے سرمایہ کو مضاربت پر دیا جائے گا اور حاصل ہونے والے نفع کو فنڈ کے مقاصد میں خرچ کیا جائے گا۔

تنشئ شركة التامين الاسلامی صندوقا للوقف و تعزل جزءا معلوما من راس مالها يكون وقفا على المتضررين من المشتركين فی الصندوق حسب لوائح الصندوق و على الجهات الخيرية فی النهاية...... فيبقى هذا الجزء المعلوم من النقود مستثمرا بالمضاربة وتدخل الارباح فی الصندوق لاغراض الوقف.

2- وقف فنڈ کسی کی ملکیت میں نہیں ہوتا۔ اس کی خود اپنی معنوی شخصیت ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ مالک بنتا ہے اور مالک بناتا ہے۔

ان صندوق الوقف لا يملكه احد، و تكون له شخصية معنوية يتمكن بها من ان يتملک الاموال ويستثمرها و يملكها حسب اللوائح المنظمة لذلک.

3- انشورنس میں دلچسپی لینے والے فنڈ کی شرائط کے مطابق اس کو چندہ دے کر فنڈ کے ممبر بن سکتے ہیں۔

ان الراغبین فی التامین یشترکون فی عضویة الصندوق بالتبرع الیه حسب اللوائح

4- انشورنس پالیسی لینے والے وقف فنڈ کو جو چندہ دیں گے وہ ان کی ملکیت سے نکل کر وقف فنڈ کی ملکیت میں داخل ہو جائے گا خود وقف نہ ہوگا۔ لہٰذا اس رقم کی اس طرح سے حفاظت واجب نہ ہوگی جس طرح وقف رقم کی واجب ہوتی ہے۔ وقف فنڈ کے فائدے کے لئے چندہ کی رقم کو بھی نفع بخش کاروبار میں لگایا جائے گا اور چندے کی اصل رقم کو اس کے منافع سمیت نقصانات کی تلافی کیلئے اور وقف کے دیگر مقاصد کیلئے خرچ کیا جا سکے گا۔

ما یتبرع به المشترکون یخرج من ملکهم ویدخل فی ملک الصندوق الوقفی، وبما انه لیس وقفا و انما هو مملوک للوقف ...... فلا یجب الاحتفاظ بمبالغ التبرع کما یجب فی النقود الموقوفة، و انما تستثمر لمصالح الصندوق و تصرف مع ارباحها لدفع التعویضات واغراض الوقف الاخری.

5- فنڈ کا شرائط نامہ ان شرائط کی تصریح کرے گا جن پر پالیسی لینے والے بیمہ کی رقم کے حقدار بنیں گے۔

تنص لائحة الصندوق علی شروط استحقاق المشترکین للتعویضات و مبالغ التبرع التی یتم به الاشتراک فی کل نوع من انواع التعیین.

6- پالیسی لینے والوں کو بیمہ کی جو رقم ملے گی وہ ان کے چندے کا عوض نہیں ہوگی بلکہ وقف فنڈ کی شرائط کے مطابق اس کے حقدار بننے کی وجہ سے ملے گی۔

ما یحصل علیه المشترکون من التعویضات لیس عوضا عما

تبرعوا به، وانما هو عطاء مستقل من صندوق الوقف لدخولهم فی جملة الموقوف علیهم حسب شروط الوقف.

7-وقف فنڈ کی ملکیت میں مندرجہ ذیل رقمیں ہوں گی:

i-وقف نقدی سے حاصل ہونے والا نفع

ii-پالیسی لینے والوں کے چندے

iii-چندوں سے حاصل ہونے والے منافع

اور وقف فنڈ کو اختیار ہے کہ وہ ان رقموں میں وقف فنڈ کی شرائط کے مطابق تصرف کرے۔لہٰذا وقف فنڈ خالص نفع میں جو چاہے تصرف کرسکتا ہے مثلاً

i-وہ اس خالص نفع کو احتیاط کے طور پر اپنے پاس رکھے تاکہ آئندہ سالوں میں ہونے والے اتفاقیہ نقصان اور خسارے سے بچ سکے یا

ii-وہ پورے خالص نفع کو یا اس کے ایک حصہ کو فنڈ کے ممبران میں تقسیم کرے۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف فنڈ خالص نفع کے تین حصے کرے۔

i-ایک حصہ احتیاط کے طور پر آئندہ پیش آنے والے نقصانات کی تلافی کیلئے رکھ لے۔

ii-ایک حصہ ممبران میں تقسیم کردے تاکہ مروجہ انشورنس سے فرق ہوسکے۔

iii-ایک حصہ نیکی کے کاموں میں خرچ کیا جائے تاکہ فنڈ کا وقف ہونا بھی واضح رہے۔

حیث ان الصندوق الوقفی مالک لجمیع امواله بما فیه ارباح النقود الوقفیة والتبرعات التی قدمها المشترکون مع ماکسبت من الارباح بالاستثمار فان للصندوق التصرف المطلق فی هذه الاموال حسب الشروط المنصوص علیها فی لوائحه. فللصندوق ان یشترط

علی نفسه بما شاء بشان ما یسمی الفائض التامینی فیجوز ان یمسکه فی الصندوق کا حتیاطی لما قد یحدث من النقص فی السنوات المقبلة، ویجوز ان یشترط علی نفسه فی اللوائح ان یوزعه کلا او جزء ا منه علی المشترکین.

و ربما یستحسن ان یقسم الفائض علی ثلاثة اقسام: قسم یحتفظ به کا حتیاطی، و قسم یوزع علی المشترکین لتجلیة الفرق الملموس بینه و بین التامین التقلیدی بشکل واضح لدی عامة الناس، و قسم یصرف فی وجوه الخیر لابراز الصفة الوقفیة للصندوق کل سنة.

9- انشورنس کمپنی وقف فنڈ کا انتظام کرے گی اور اس کے مال کو بڑھائے گی، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

i- انتظام: انشورنس کمپنی وقف کے متولی کی طرح انتظام کرے گی یعنی پالیسی لینے والوں سے چندے وصول کرے گی، حقداروں کے نقصان کا تدارک کرے گی، خالص نفع کو فنڈ کی شرائط کے مطابق تقسیم کرے گی اور فنڈ کے حسابات کمپنی کے حسابات سے الگ رکھے گی۔

ان سب خدمات پر کمپنی اجرت لے گی۔

ii- مال بڑھانا: اس کے لئے کمپنی وکیل بالاجرت بن کر کام کرے گی یا مضارب کی طرح کام کرے گی اور اپنے حصہ کا نفع لے گی۔

ان شرکة التامین التی تنشئ الوقف تقوم بادارة الصندوق واستثمار امواله. اما ادارة الصندوق فانما تقوم به کمتول للوقف فتجمع بهذه الصفة التبرعات و تدفع التعویضات و تتصرف فی الفائض حسب شروط الوقف و تفصل حسابات الصندوق من

حساب الشركة فصلا تاما و تستحق لقاء هذه الخدمات اجرة. واما استثمار اموال الصندوق فيمكن ان تقوم به كوكيل للاستثمار فتستحق بذلك اجرة او تعمل فيها كمضارب فتستحق بذلك جزء ا مشاعا من الارباح الحاصلة بالا ستثمار.

10-اس طرح کمپنی تین طریقوں سے فائدہ حاصل کرے گی۔

i-اپنے سرمایہ کے منافع سے

ii-وقف فنڈ کے انتظام کی اجرت سے

iii-مضاربت میں نفع کے حصہ سے

وعلى هذا الاساس يمكن ان تكسب الشركة عوائد من ثلاث جهات: اؤلا باستثمار راس مالها، و ثانيا باجرة ادارة الصندوق، و ثالثا بنسبة من ربح المضاربة

تکافل یا اسلامی انشورنس کے نظام کا حاصل

اسلامی انشورنس کمپنی اپنے کچھ سرمایہ سے ایک وقف فنڈ قائم کرتی ہے۔اس فنڈ کی شرائط میں سے ہے کہ وقف فنڈ کے جن ممبران کا کسی حادثہ میں نقصان ہو جائے اس فنڈ کے منافع میں سے ان کے نقصان کی تلافی کی جائے گی۔فنڈ کا ممبر بننے کیلئے اس میں ایک خاص چندہ دینا ہوگا جو ہر نوع کی انشورنس کے مطابق ہوگا۔

اسلامی انشورنس کمپنی ایک تو وقف فنڈ کا انتظام کرتی ہے اوراس سے متعلقہ تمام خدمات کو اجرت پر سرانجام دیتی ہے اور دوسرے وقف فنڈ کی وقف شدہ اور مملوکہ رقموں پر مضارب کے طور پر کام کرتی ہے اور نفع میں سے اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔

اس طرح سے کمپنی کو ہونے والی آمدنی کی تین جہتیں ہیں (1) فنڈ سے متعلقہ

خدمات فراہم کرنے پر اجرت (2) اپنے سرمایہ کا نفع اور (3) مضاربت میں نفع کا حصہ۔

تکافل یا اسلامی انشورنس کے نظام کی بنیادیں باطل ہیں

ہم نے پوری دیانتداری سے اس نظام کا مطالعہ کیا اور اس پر غور وفکر کیا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے اس کو وقف کے جن قواعد پر اٹھایا ہے ہم نے ان قواعد کو اس کا ساتھ دیتا ہوا نہیں پایا۔ مولانا مدظلہ نے ان قواعد کو آپس میں جوڑ کر تکافل کا نظام بنایا ہے حالانکہ غیر منقولہ جائیداد میں وہ اگرچہ جڑتے ہیں لیکن خصوصاً نقدی کے وقف میں ان کا جڑنا محل نظر ہے۔ مولانا مدظلہ نے مروجہ انشورنس کے اسلامی متبادل کی تحصیل میں تسامح سے کام لیا ہے حالانکہ ضرورت تھی کہ معاشیات کے موجودہ ترقی یافتہ دور میں تکافل کے نظام کی بنیادیں خوب مضبوط ہوتیں۔

پہلی باطل بنیاد

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کا ذکر کردہ پہلا قاعدہ کہ ''نقدی کا وقف درست ہے'' اور دوسرا قاعدہ کہ ''واقف اپنی زندگی میں بلاشرکت غیرے اپنے وقف سے خود نفع اٹھا سکتا ہے۔'' یہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن ان کو جوڑنا درست نہیں ہے۔

مولانا دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں

فی الذخیرة: اذا وقف ارضا او شیئا آخر و شرط الکل لنفسه او شرط البعض لنفسه ما دام حیا و بعده للفقراء قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ الوقف صحیح و مشائخ بلخ رحمهم الله اخذوا بقول ابی یوسف و علیه الفتوی ترغیبا للناس فی الوقف...... و لو قال ارضی هذه صدقة موقوفة تجری غلتها

علی ما عشت ثم بعدی علی ولدی و ولد ولدی و نسلھم ابدا ما تنا سلوا فان انقرضوا فھی علی المساکین جاز ذلک کذا فی خزانة المفتین"

ذخیرہ میں ہے، جب کوئی شخص کوئی زمین یا کوئی اور شے وقف کرے اور یہ شرط کرے کہ جب تک وہ زندہ ہے وہ کل وقف کو یا اس کے ایک حصہ کو اپنے استعمال میں رکھے گا تو ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وقف صحیح ہے اور مشائخ بلخ نے ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے قول کو اختیار کیا اور اسی پر فتویٰ ہے تا کہ لوگوں کو وقف کرنے میں رغبت رہے......اور اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میری یہ زمین صدقہ وقف ہے اور جب تک میں زندہ ہوں میں اس کی آمدنی لوں گا اور میرے بعد میری اولاد پر اور اولاد کی اولاد پر اور میری پوری نسل پر جب تک وہ چلے، پھر جب میری نسل ختم ہو جائے تو وہ مساکین پر وقف ہے تو جائز ہے۔ **خزانة المفتین** میں ایسے ہی ہے۔

ہم کہتے ہیں

واقف کا یہ شرط کرنا کہ زندگی بھر وقف کردہ شے سے صرف وہی نفع اٹھائے گا بلکہ اپنی اولاد اور پوری نسل کیلئے بھی یہ شرط کرنا غیر منقولہ جائیداد میں تو متصور ہے کیونکہ وہ جائیداد خود ابدی و دائمی ہوتی ہے کبھی ضائع نہیں ہوتی جبکہ نقدی اور دیگر منقولہ اشیاء میں ابدیت و دوام کی توقع ہی نہیں ہوتی بلکہ نقدی میں تو خطرہ ہوتا ہے کہ کاروباری نقصان کے باعث اصل رقم کچھ یا کل ہی جاتی رہے جبکہ دیگر منقولہ اشیاء مثلاً بہت سے برتن، کتابیں اور مصاحف وغیرہ تیس چالیس سال کے استعمال سے بوسیدہ ہو جاتی ہیں اور کسی دوسرے کے کام کی نہیں رہتیں۔ علاوہ ازیں وہ کسی حادثہ کا

شکار بھی ہوسکتی ہیں اور چوری بھی ہوسکتی ہیں۔ اس لئے منقولہ اشیاء میں صرف یہی صورت ممکن ہے کہ آدمی ان کو وجوہ خیر میں فوری وقف کردے اور شرط کردے کہ وہ خود بھی دوسرے کے ساتھ نفع اٹھائے گا یا وقف کے منافع کا حقدار ہونے کی وجہ سے دوسرے حقداروں کے ساتھ شریک ہوگا۔

ہماری بات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں

1-اگرچہ منقولہ اشیاء میں وقف درست ہے لیکن وہ خلاف قیاس محض استحسان کی وجہ سے درست ہے یعنی حدیث کی وجہ سے، تعامل کی وجہ سے اور فقراء کیلئے نفع ہونے کی وجہ سے۔

لا یجوز وقف ما ینقل ویحول...... وقال محمد یجوز حبس الکراع و السلاح و معناہ و وقفه فی سبیل اللہ و ابو یوسف معه فیه علی ما قالوا وھو استحسان. والقیاس ان لا یجوز لما بیناہ من قبل (من شرط التابید والمنقول لا یتأ بد)

وجه الاستحسان الآثار المشھورۃ ای فی الکراع و السلاح

وعن محمد انه یجوز وقف ما فیه تعامل من المنقولات کالفاس والمر والقدوم والمنشار والجنازۃ و ثیابھا والقدر والمرجل والمصاحف وعند ابی یوسف لا یجوز لان القیاس انما یترک بالنص والنص ورد فی الکراع والسلاح فیقتصر علیه و محمد یقول القیاس قد یترک بالتعامل کما فی الاستصناع وقد وجد التعامل فی ھذہ الاشیاء (ھدایه)

جب منقولہ اشیاء میں وقف کے ثبوت کی بنیادیں ہی جدا ہیں تو ان میں غیر

منقولہ جائیداد کے وقف کے ایک حکم یعنی وقف علی النفس کو جاری کرنا یا تو قیاس سے ہوگا یا استحسان سے ہوگا۔ استحسان صرف گھوڑے اور ہتھیار میں ہے کسی اور منقولہ شے میں نہیں ہے۔ رہا قیاس تو وہ ممکن ہی نہیں کیونکہ منقولہ وغیر منقولہ میں فارق موجود ہے یعنی یہ فرق ہے کہ غیر منقولہ جائیداد ابدی و دائمی ہوتی ہے اور منقولہ شے عارضی اور غیر دائمی ہوتی ہے اور قربت مطلوبہ و مقصودہ تک اس کا پہنچنا مخدوش و مشکوک ہوتا ہے۔

تنبیہ:

یہاں ہم نے قربت مطلوبہ و مقصودہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقف علی النفس کی صورت میں دو قسم کی قربتیں ذکر کی جاتی ہیں۔ ایک وہ جو وقف ہونے کی وجہ سے لازمی ہے ابن ہمام رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

لان الوقف يصح لمن يحب من الاغنياء بلا قصد القربة وهو وان كان لا بد فى آخره من القربة بشرط التابيد وهو بذلك كالفقراء و مصالح المسجد (فتح القدير)

ترجمہ: قربت کے قصد کے بغیر وقف اغنیار کے حق میں بھی صحیح ہوتا ہے اگرچہ اغنیاء کے بعد ابدیت کی شرط کے ساتھ قربت کے لئے مثلاً اس کا فقراء کیلئے ہونا یا مصالح مسجد کیلئے ہونا ناگزیر ہے۔

اور ابن نجیم رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

وقد يقال ان الوقف على الغنى تصدق بالمنفعة لان الصدقة كماتكون على الفقراء تكون على الاغنياء. وان كان التصدق على الغنى مجازا عن الهبة عند بعضهم و صرح فى الذخيرة بان فى التصدق على الغنى نوع قربة دون قربة الفقير (البحر الرائق ص

187 ج 5)

ترجمہ: کہا جاتا ہے کہ غنی پر وقف منفعت کا صدقہ ہوتا ہے کیونکہ صدقہ جیسے فقراء پر ہوتا ہے اسی طرح اغنیاء پر بھی ہوتا ہے۔اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک غنی پر صدقہ کا مطلب ہبہ و ہدیہ ہوتا ہے اور ذخیرہ میں تصریح ہے کہ غنی پر صدقہ بھی ایک نوع کی قربت اور نیکی ہے جو فقیر کے ساتھ نیکی سے کمتر درجہ کی ہوتی ہے۔

ہم کہتے ہیں

کہ غنی پر صدقہ والی بات اگرچہ فی نفسہ کمزور ہے لیکن اگر اس کو تسلیم بھی کیا جائے تو اس کا فائدہ فقط اتنا ہوگا کہ وقف علی النفس یا وقف علی الاغنیاء کے وقف ہونے کی ایک توجیہ بن جائے گی لیکن اس کے باوجود بالآخر اس کا ابدی طور پر فقراء پر یا مصالح مسجد پر وقف ہونا لازمی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ فقراء پر صدقہ قربت مقصودہ ہے جبکہ اغنیاء پر صدقہ اگر قربت بھی ہو تو وہ اس درجہ کی نہیں کہ اس کو آخرت کے اعتبار سے مقصود کہا جا سکے بلکہ عام طور سے امیروں کو دینے کو نیکی سمجھا ہی نہیں جاتا سوائے اس کے کہ ساتھ میں پائی جانے والی اچھی نیت نیکی اور ثواب کا باعث ہوتی ہے۔

اس پر کوئی کہے کہ صاحب ہدایہ نے تو اس کو بھی قربت مقصودہ کہا ہے جب کہ وہ امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے قول کی تائید میں لکھتے ہیں۔

ولان مقصوده القربة و فی الصرف الی نفسه ذلک قال علیه الصلاة والسلام نفقة الرجل علی نفسه صدقة

ترجمہ: وجہ یہ ہے کہ واقف کا مقصود قربت و نیکی ہوتی ہے۔اور اپنے اوپر خرچ کرنا بھی نیکی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی کا اپنے اوپر خرچ کرنا صدقہ ہے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی اپنے اوپر ضروری خرچ کرتا ہے اور ثواب پاتا ہے لیکن فقط اپنے اوپر خرچ کرنے کیلئے کوئی وقف نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا شرعی ثبوت ہے ورنہ تو بہت سے لوگ اپنی بہت سی چیزوں کو وقف قرار دے دیں۔ وقف میں شے اپنی ملک سے نکلتی ہے اور بالآخر فقراء میں یا وجوہ خیر میں جاتی ہے اور انہی کے اعتبار سے وقف کیا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے لوگوں کو وقف علی النفس کی ترغیب دی جاتی ہے کہ اپنا دنیوی فائدہ بھی ہے اور بالآخر ثواب بھی ہے۔

قال الصدر الشهيد و الفتوى على قول ابى يوسف و نحن ايضا نفتى بقوله ترغيبا للناس فى الوقف...... و فى الحاوى القدسى المختار للفتوى قول ابى يوسف ترغيبا للناس و تكثيرا للخير (البحر الرائق ص 220 ج 5)

ترجمہ: صدر شہید رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ فتویٰ امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے قول پر ہے اور ہم انہی کے قول پر فتوی دیتے ہیں تا کہ لوگوں کو وقف کرنے میں رغبت ہو...... حاوی قدسی میں ہے کہ فتوے کے لئے مختار قول امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا ہے تا کہ لوگوں کو وقف کرنے میں رغبت ہو اور خیر کی صورتیں زیادہ بنیں۔

اس سے واضح ہوا کہ وقف کرنے میں اصل مقصود فقراء یا دیگر وجوہ خیر ہیں خود اپنی ذات یا اغنیاء اصل مقصود نہیں بلکہ وہ تو بطور وسیلہ ہیں۔

2- امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ جو کہ غیر منقولہ جائیداد میں وقف علی النفس کے قائل ہیں منقولہ اشیاء میں سے گھوڑوں کو فی سبیل اللہ وقف کرنے کے بھی قائل ہیں لیکن اس کے باوجود ابن ہمام رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

ثم اذا عرف جواز وقف الفرس والجمل فى سبيل الله فلو وقفه على ان يمسكه ما دام حيا ان امسكه للجهاد جاز له ذلك لانه لولم

يشترط كان له ذلک لان لجاعلى فرس السبيل ان يجاهد عليه و ان اراد ان ينتفع به فى غير ذلک لم يكن له ذلک و صح جعله للسبيل يعنى يبطل الشرط و يصح وقفه فتح القدير ص 219 ج 6)

ترجمہ: پھر جب گھوڑے اور اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کرنے کا جواز معلوم ہوا تو اگر کسی نے اس شرط کے ساتھ گھوڑے کو وقف کیا کہ وہ اپنی زندگی بھر اس کو اپنے پاس رکھے گا تو اس میں دو صورتیں ہیں۔

(i) اگر اس پر خود جہاد کرنے کیلئے اس کو اپنے پاس رکھا تو یہ اس کے لئے جائز ہے کیونکہ اگر وہ یہ شرط نہ بھی کرے تب بھی اس کو حق حاصل ہے کہ خود اس پر جہاد کرے۔

(ii) اور اگر وقف کرنے والے کی مراد یہ ہے کہ وہ گھوڑے کو اپنے دیگر ذاتی کاموں میں استعمال کرے تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہے اور اس کا وقف تو صحیح ہوگا لیکن شرط باطل اور کالعدم ہوگی۔

اس جزئیہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ منقولہ اشیاء میں وقف اسی وقت جائز ہوگا جب وہ وجوہ خیر یا فقراء میں فوری اور نقد وقف ہو وقف علی النفس کے بعد نہ ہو۔ اور اگر وقف علی النفس کیا ہو تو وقف تو ہو جائے گا لیکن علی النفس نہ ہوگا۔

لیکن تنقیح فتاوی حامدیہ میں اس کے مخالف دو فتوے ملتے ہیں۔ اس لئے ہم پہلے ان کو نقل کرتے ہیں پھر ہم اپنی بات کہیں گے۔

1- فى فتاوى الشلبى وقف البناء بدون الارض صحيح والحكم به صحيح لكن فى وقفه على نفسه اشكال من جهة ان الوقف على النفس اجازه ابو يوسف ومنعه محمد. وقف البناء بدون الارض من قبيل وقف المنقول ولا يقول به ابو يوسف بل محمد فيكون الحكم به

مر کبا من مذهبین وهو لا یجوز لکن الطرسوسی ذکر ان فی منیة المفتی ما یفید جواز الحکم المرکب من مذهبین و علی هذا یتخرج الحکم بوقف البناء علی نفسه فی مصرفی اوقاف کثیرة علی هذا النمط حکم بها القضاء السابقون و لعلهم بنوه علی ما ذکرنا من جواز الحکم المرکب من مذهبین او علی ان الارض لما کانت متقررة للاحتکار نزلت منزلة ما لو وقف البناء مع الارض من جهة ان الارض بید ارباب البناء یتصرفون فیها بما شاء وا من هدم و بناء و تغییر لا یتعرض احد لهم فیها ولا یزعجهم عنها وانما علیهم غلة توخذ منهم کما افاده الخصاف.

ترجمہ: فتاویٰ شلبی میں ہے زمین کے بغیر محض عمارت کا وقف صحیح ہے اور اس کا حکم بھی صحیح ہے لیکن اس کو اپنے اوپر وقف کرنے میں اس اعتبار سے اشکال ہے کہ اپنے اوپر وقف کو امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے جائز کیا ہے اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہ نے ناجائز کیا ہے۔ زمین کے بغیر محض عمارت کا وقف منقول کا وقف ہے جس کے امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ قائل نہیں بلکہ امام محمد رحمتہ اللہ علیہ قائل ہیں۔ لہٰذا اس کا حکم دو مذہبوں سے مرکب ہوا اور یہ جائز نہیں ہے۔ لیکن طرسوسی نے ذکر کیا کہ منیۃ المفتی میں ایسی بات مذکور ہے جس سے دو مذہبوں سے مرکب حکم جائز معلوم ہوتا ہے اور اسی پر مصر میں بہت سے اوقاف میں ان کے اوپر عمارت کے وقف کا حکم نکلتا ہے۔ گزشتہ قاضیوں نے اسی طرح سے فیصلہ دیا۔ ان کا فیصلہ یا تو اس پر مبنی ہے جو ہم نے ذکر کیا کہ دو مذہبوں سے مرکب حکم جائز ہوتا ہے یا اس پر مبنی تھا کہ زمین احتکار کی تھی یعنی تعمیر کو برقرار رکھنے کیلئے سرکاری زمین کرایہ پر لی گئی تھی (الاستحکار عقد اجارة یقصد به استبقاء الارض مقررة للبناء والغرس او

لاحدهما. ردالمختار ص428ج) تو گویا عمارت زمین سمیت وقف تھی۔وجہ یہ تھی کہ وہ زمین عمارت کے مالکان کے قبضہ میں ہوتی ہے اور وہ عمارت میں جو چاہے تصرف کرتے ہیں گراتے ہیں، بناتے ہیں اور اس میں تبدیلی کرتے ہیں اور حکومت ان سے کچھ تعرض نہیں کرتی بس ان سے زمین کا کرایہ وصول کرتی رہتی ہے۔اس زمین میں مالکان کی وراثت بھی چلتی ہے اور وارثوں میں تقسیم بھی ہوتی ہے۔

وذكر في اوقاف الخصاف ان وقف حوانيت الا سواق يجوز ان كانت الارض باجارة في ايدى الذين بنوها لا يخرجهم السلطان عنها من قبل انا رايناها في ايدى اصحاب البناء توارثوها و تقسم بينهم لا يتعرض لهم السلطان فيها ولا يزعجهم وانما له غلة يا خذها منهم و تداولها خلف عن سلف و مضى عليها الدهور وهي في ايديهم يتبايعونها و يؤجرونها و تجوز فيها و صاياهم و يهدمون بناء ها و يعيدونه و يبنون غيره فكذلک الوقف فيها جائز (رد المحتار ص 428ج 3)

2- وفي موضع آخر من الوقف من فتاوىٰ الشلبي ما نصه فاذا كان وقف الدراهم لم يرو الا عن زفر ولم يروعنه في وقف النفس شئ فلا يتأتى وقفها على النفس حينئذ على قوله لكن لو فرضنا ان حاكما حنفيا حكم بصحة وقف الدراهم على النفس هل ينفذ حكمه فنقول النفاذ مبنى على القول بصحة الحكم الملفق و بيان التلفيق ان الوقف على النفس لا يقول به الا ابو يوسف وهو لا يرى وقف الدراهم و وقف الدراهم لايقول به الا زفروهو لا يرى الوقف على النفس فكان الحكم بجواز وقف الدراهم على النفس حكما ملفقا من قولين

كما ترى. و قد مشى شيخ مشائخنا العلامة زين الدين قاسم فى ديباجة تصحيح القدورى على عدم نفاذه و نقل فيها عن كتاب توفيق الحكام فى غوامض الاحكام ان الحكم الملفق باطل باجماع المسلمين و مشى الطرسوسى فى كتابه انفع الوسائل على النفاذ مستندا فى ذلك لما راه فى منية المفتى.

ترجمہ: فتاویٰ شلبی ہی میں ایک اور مقام پر یہ ذکر ہے کہ دراہم کا وقف صرف امام زفر رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے جبکہ ان سے اپنے اوپر وقف کے بارے میں کچھ منقول نہیں ہے لہٰذا ان کے قول پر دراہم کا وقف علی النفس نہیں بنتا لیکن اگر ہم فرض کریں کہ کسی حنفی حاکم نے دراہم کے وقف علی النفس کے صحیح ہونے کا حکم جاری کیا تو کیا اس کا حکم نافذ ہوگا۔؟

ہم کہتے ہیں نافذ ہونا اس پر مبنی ہے کہ تلفیق شدہ حکم کو صحیح مانا جائے اور تلفیق کا بیان یہ ہے کہ وقف علی النفس کے قائل امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو دراہم کے وقف کے قائل نہیں جبکہ دراہم کے وقف کے قائل امام زفر رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو وقف علی النفس کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا دراہم کا وقف علی النفس ایسا حکم ہے جو دو قولوں کی تلفیق سے حاصل ہوا ہے۔ علامہ زین الدین قاسم رحمتہ اللہ علیہ نے دیباجہ تصحیح القدوری میں لکھا ہے کہ وہ حکم نافذ نہ ہوگا۔ وہیں انہوں نے کتاب توفیق الحکام فی غوامض الاحکام سے نقل کیا کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ تلفیق شدہ حکم باطل ہوتا ہے جبکہ طرسوسی نے اپنی کتاب انفع الوسائل میں حکم کے نافذ ہونے کو اختیار کیا اس وجہ سے جو منیۃ المفتی میں مذکور ہے)۔

پھر علامہ ابن عابدین رحمتہ اللہ علیہ حکم کے نافذ ہونے کے حق میں لکھتے ہیں:

و رايت بخط شيخ مشائخنا ملا على التركمانى فى مجموعته

الكبيرة ناقلا عن خط الشيخ ابراهيم السوالاتی بعد هذه المسئلة المنقولة عن فتاویٰ الشلبی ما نصه اقول و بالجواز افتی شیخ الاسلام ابو السعود فی فتاواه و ان الحکم ینفذ و علیه العمل.

ترجمہ: میں نے اپنے شیخ المشائخ ملا علی ترکمانی کے بڑے مجموعہ میں ان کے ہاتھ کی تحریر دیکھی۔ انہوں نے شیخ ابراہیم سوالاتی کی تحریر نقل کی جس میں فتاویٰ شلبی کے ذکر کردہ مسئلہ کے بعد یہ لکھا تھا کہ شیخ الاسلام ابو سعود نے اپنے فتاویٰ میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور یہ کہ حکم نافذ ہے اور اس پر عمل ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن عابدین رحمتہ اللہ علیہ نے علامہ قاسم رحمتہ اللہ علیہ کی اس بات کا کہ تلفیق شدہ حکم مسلمانوں کے اجماع سے باطل ہے یہ جواب دیا کہ

المراد بما جزم ببطلانه ما اذا کان من مذاهب متباینة...... بخلاف ما اذا کان ملفقا من اقوال اصحاب المذهب الواحد.

جس تلفیق شدہ حکم کے بطلان کا انہوں نے جزم کیا اس سے مراد مختلف مذاہب سے ملا کر بنایا ہوا حکم ہے...... بخلاف اس صورت کے جب تلفیق شدہ حکم ایک ہی مذہب کے اصحاب کا ہو۔

ہم کہتے ہیں

علامہ شلبی رحمتہ اللہ علیہ کے دونوں فتوے محل نظر ہیں۔

1- ان کے مذکورہ بالا دونوں ہی فتوے اس پر مبنی ہیں کہ دو قولوں سے ترکیب و تلفیق شدہ حکم جبکہ وہ دونوں قول ایک مذہب کے ہوں جائز ہوتا ہے۔ تلفیق میں جو دو قول جمع کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

i- نقدی و منقولات کا وقف جائز ہے امام محمد و امام زفر رحمہما اللہ کے نزدیک

ii- وقف علی النفس جائز ہے امام ابو یوسف کے نزدیک

لیکن امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ تو منقولات اور نقدی میں وقف ہی کے قائل نہیں تو لامحالہ ان میں وقف علی النفس کے بھی قائل نہیں ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک وقف علی النفس مطلق نہیں ہے مقید ہے غیر منقولات کے ساتھ۔ اس کو مطلق لینے کی کوئی وجہ اور دلیل موجود نہیں ہے۔ اسی طرح امام زفر رحمہ اللہ کے نزدیک دراہم کے وقف کا جواز مقید ہے اس کے ساتھ کہ وہ فقراء پر ہو علی النفس نہ ہو۔ کیونکہ وہ وقف علی النفس کے قائل ہی نہیں ہیں۔

اب دو قول یوں بنے:

i- غیر منقولات کا وقف علی النفس جائز ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک۔

ii- نقدی و منقولات کا وقف فقراء پر جائز ہے امام زفر رحمہ اللہ کے نزدیک۔

دونوں قولوں کو ملائیں تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ غیر منقولات کا وقف علی الفقراء و علی النفس جائز ہے اور منقولات و نقدی کا وقف صرف علی الفقراء جائز ہے۔ اس سے تلفیق نہیں بنتی۔ کیونکہ تلفیق میں ہر ایک کے حکم کو پورا بعینہ لیا جاتا ہے یہ نہیں کہ مقید کو مطلق لے لیا اور مطلق کو مقید کر کے لے لیا۔ غرض علامہ طرسوسی رحمتہ اللہ علیہ کا بتایا ہوا تلفیق شدہ حکم حقیقت میں تلفیق کا نتیجہ نہیں بلکہ منقولات کو غیر منقولات کے وقف علی النفس پر قیاس کا نتیجہ ہے جس کے بارے میں ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے۔

2- پہلے فتوے میں علامہ شلبی رحمتہ اللہ علیہ نے طرسوسی رحمتہ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ

وعلى هذا يتخرج الحكم بوقف البناء على نفسه في مصر في اوقاف كثيرة على هذا النمط حكم بها القضاة السابقون ولعلهم بنوه

علی ما ذکرنا من جواز الحکم المرکب من مذھبین او علی ان الارض لما کانت متقررة للاحتکار نزلت منزلة ما لو وقف البناء مع الارض

ترجمہ: اور اسی پر مصر کے بہت سے اوقاف میں ان کے اوپر عمارت کے وقف کا حکم ملتا ہے۔ گزشتہ قاضیوں نے اسی طرح سے فیصلہ دیا۔ شاید ان کا فیصلہ یا تو اس پر مبنی ہے جو ہم نے ذکر کیا کہ دو مذہبوں سے مرکب حکم جائز ہوتا ہے یا اس پر مبنی ہے کہ زمین احتکار کی تھی تو گویا عمارت زمین سمیت وقف کی گئی تھی۔

ہم کہتے ہیں

طرسوسی رحمتہ اللہ علیہ نے بات کو اس طرح سے ذکر کیا ہے گویا گزشتہ قاضی بہت سے اوقاف میں زمین کے بغیر عمارت کے وقف علی النفس کے جواز کا فیصلہ دیتے رہے ہیں حالانکہ اور حضرات ان کی طرف صرف عمارت کے وقف کے جواز کے فیصلہ کی نسبت کرتے ہیں اس کے وقف علی النفس کے فیصلہ کی نہیں۔

ابن ہمام رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

و فی الفتاوی لقاضی خان وقف بناء بدون ارض قال ھلال لا یجوز انتھی لکن فی الخصاف ما یفید ان الارض اذا کانت متقررة الاحتکار جاز فانه قال فی رجل وقف بناء دار له دون الارض انه لا یجوز. قیل له فما تقول فی حوانیت السوق ان وقف رجل حانوتا منھا؟ قال ان کان الارض اجارة فی ایدی القوم الذین بنوھا لا یخرجھم السلطان عنھا فالوقف جائز...... و تداولھا الخلفاء ومضی علیھا الدھور وھی فی ایدیھم...... فافاد ان ما کان مثل ذلک جاز وقف البنیان فیه و الا فلا (فتح القدیر ص217 ج 6)

ترجمہ: فتاوی قاضی خان میں زمین کے بغیر صرف عمارت کے وقف کے بارے میں ہلالؒ کہتے ہیں یہ جائز نہیں۔ لیکن خصاف کی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین جب احتکار کے لئے ہو تو جائز ہے کیونکہ خصافؒ نے کہا کہ جو شخص زمین کے بغیر صرف عمارت کو وقف کرے تو یہ جائز نہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ بازار کی دکانوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جب کوئی ان میں سے کوئی دکان وقف کر دے۔ انہوں نے فرمایا اگر زمین دکان والوں کے پاس کرایہ یا لیز پر اس طور سے قبضہ میں ہو کہ وہ جو چاہتے ہیں بناتے ہیں حکومت ان کو وہاں سے کئی کئی زمانوں تک بے دخل نہیں کرتی تو وقف جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو صورت اس کی مثل ہو اس میں بھی وقف جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

ایسے ہی علامہ شامی رحمتہ اللہ علیہ نے ردالمحتار میں خصاف رحمتہ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔

3- پہلے فتوے میں طرسوسی رحمتہ اللہ علیہ نے زمین کے بغیر عمارت کے وقف علی النفس کے جواز کی دو ممکنہ وجوہات بتائی ہیں۔ اور اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ سابقہ قاضیوں نے اپنے فیصلہ کی بنیاد ان ہی دو میں سے کسی ایک کو بنایا ہے، گویا علامہ طرسوسی خود تردد میں ہیں کہ واقعی وجہ کیا ہے؟ اور ان دونوں وجہوں کا حال ہم بیان کر چکے ہیں کہ تلفیق بنتی نہیں اور گزشتہ حکام کا فیصلہ زمین کے بغیر عمارت کے صرف وقف کے جواز کے بارے میں ہے وقف علی النفس کے جواز کے بارے میں نہیں۔ اور اگر وقف علی النفس کے جواز کے حکم کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو وہ احتکار والی زمین میں موجود عمارت کے بارے میں ہے جس کے ساتھ زمین بھی گویا وقف ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا خالص منقول میں وقف علی النفس کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

3- علامہ شلبی کے دوسرے فتوے کا مدار بھی طرسوسی رحمتہ اللہ علیہ پر اور ان کے

اس قول پر ہے کہ نقدی میں وقف علی النفس حکم ملفق و مرکب ہے۔اس تلفیق کی حقیقت ہم اوپر بتا چکے ہیں۔

رہی یہ بات کہ طرسوسی رحمتہ اللہ علیہ کی بات کو علامہ شلبی اور شیخ الاسلام ابوسعود اور علامہ شامی رحمہم اللہ نے بھی اختیار کیا ہے تو اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ جب انہوں نے دلیل ذکر کی ہے تو اب دلیل کی حقیقت کو دیکھا جائے گا اشخاص کو نہیں۔

2-دوسری باطل بنیاد، یہ سود اور قمار پر مبنی ہے

اوپر ہم مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی یہ دو باتیں ذکر کر چکے ہیں جو دوبارہ ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔

i- ان الوقف له شخصية اعتبارية فى كل من الشريعة والقانون

قانون اور شریعت دونوں ہی میں وقف کو قانونی واعتباری شخصیت حاصل ہے۔

ii- ما يتبرع به المشتركون يخرج من ملكهم و يدخل فى ملك الصندوق الوقفى و بما انه ليس وقفا و انما هو مملوك للوقف

پالیسی ہولڈر جو چندہ دیتے ہیں ان کی ملکیت سے نکل کر وقف فنڈ کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ وقف کی ملکیت بنتا ہے خود وقف نہیں بنتا۔

مولانا تقی عثمانی کے دارالعلوم کراچی کے ایک استاد ڈاکٹر مولانا اعجاز احمد صمدانی صاحب کچھ وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وقف چونکہ خود شخص قانونی ہے اور دئے گئے عطیات براہ راست وقف کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں اور وقف پھر اپنے طے کردہ ضوابط کی روشنی میں کلیمز (Claims) کی ادائیگی کرتا ہے اس لئے وقف کا نظام زیادہ قابل اطمینان ہے۔“ (تکافل انشورنس کا اسلامی طریقہ ص 100)

”جو لوگ وقف کی بنیاد پر بننے والے پول کو تبرع (Donate) کرتے ہیں وہ تبرع وقف کی ملکیت میں چلا جاتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی وقف مثلاً مدرسہ یا قبرستان کیلئے چندہ دینا۔ جب کوئی چیز وقف کی ملکیت میں آجاتی ہے تو وقف اپنے قواعد کی روشنی میں وقف کیلئے چندہ دینے والے کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ گویا وقف کو چندہ دینے والے کیلئے وقف سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے چنانچہ اگر کوئی شخص مثلاً کسی مدرسہ کو چندہ دیتا ہے تاکہ اس میں مسلمانوں کے بچے زیور تعلیم سے آراستہ ہوں......تو اس کے لئے بھی جائز ہے کہ اپنے بچے کو بھی اس مدرسہ میں تعلیم دلوائے۔ یہ اس لئے کہ وہ وقف اسی مقصد کیلئے قائم ہوا ہے۔

اسی طرح وقف کی بنیاد پر جو تکافل قائم ہوتا ہے وہ خاص قسم کے افراد یعنی ایسے افراد کیلئے قائم ہوتا ہے جنہیں مخصوص قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس وقف کو تبرع کے طور پر رقم دینے والا اسی طرح پول سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح مدرسہ یا قبرستان کو چندہ دینے والا (تکافل ص 101)

ہم کہتے ہیں

تکافل میں وقف فنڈ کو چندہ دینے اور اس سے نقصان کی تلافی حاصل کرنے کے اس نظام پر چند اشکال پیدا ہوتے ہیں جن کو خود صمدانی صاحب نے ذکر کیا ہے اور پھر ان کا جواب دیا ہے۔ لیکن ان کے جواب ناکافی ہیں اور دیے گئے نظام پر اعتراض باقی رہتے ہیں۔ ان کے جواب نقل کرنے کے بعد ہم ان پر اپنا تبصرہ بھی دیں گے۔

پہلا اشکال

(مدرسہ یا کنویں کی) جو مثالیں اوپر ذکر کی گئیں ان کے اندر وقف سے فائدہ

حاصل کرنے کیلئے یہ شرط نہیں کہ وقف سے فائدہ اٹھانے والے شخص نے بھی کچھ نہ کچھ عطیہ ضرور دیا ہو بلکہ مثلاً جب کوئی کنواں وقف ہوگیا تو اب اس سے ہر پیاسا شخص پانی پی سکتا ہے چاہے اس نے کنویں کو خرید کر وقف کرنے میں کوئی حصہ ملایا ہو یا نہ ملایا ہو۔ (بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ خواہ اس نے کنویں کے اخراجات کیلئے چندہ دیا ہو یا نہ دیا ہو۔............عبدالواحد) تکافل ص103 ,102۔

صمدانی صاحب کا جواب

”وقف کے اندر اس بات کی شرعا گنجائش ہے کہ وہ کسی مخصوص طبقے یا افراد کیلئے ہو مثلاً کوئی شخص یہ شرط لگائے کہ میں فلاں باغ اس شرط پر وقف کرتا ہوں کہ اس کا پھل صرف فلاں رشتہ داروں کو یا میری اولاد کو دیا جائے یا میری زندگی میں مجھے ملتا رہے اور میرے بعد فلاں بستی کے فقراء اس سے فائدہ اٹھائیں......

وقف کرنے والا وقف کے مصالح کے پیش نظر وقف کے دائرہ کو مخصوص افراد تک محدود رکھنا چاہے تو ایسا کرسکتا ہے۔ تکافل کمپنی میں وقف کی بنیاد پر قائم پول کو اگر بالکل عام کر دیا جائے اور ہر شخص کو اس سے اپنا رسک کور (risk cover) کرنے کی اجازت دی جائے تو ظاہر ہے کہ اس پول میں ہرگز اس کی گنجائش (Capacity) نہیں لہٰذا ضروری ہوگا کہ یہ وقف کسی مخصوص طبقے کیلئے ہو۔ پس اگر واقفین شروع میں یہ شرط لگا دیں کہ اس وقف سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس وقف کو عطیہ (Donation) دیں تو یہ قید (Restriction) لگانا ناجائز نہیں ہوگا۔ (تکافل ص103)

ہم کہتے ہیں کہ

1- اشکال یہ تھا کہ اوپر دی گئی مثالوں میں مثلاً کنویں سے پانی پینے میں یا مدرسہ میں بچوں کو تعلیم دلوانے میں یہ شرط نہیں ہے کہ آدمی نے وقف کو کچھ چندہ دیا ہو جبکہ تکافل کے وقف فنڈ میں یہ شرط ہے لہٰذا وہ تکافل کی مثالیں نہ بنیں۔ ان کو تکافل کی مثالیں بنانے کیلئے صمدانی صاحب کو دو میں سے ایک کام کرنا تھا۔

i- یا تو وہ کہتے کہ کنویں سے پانی پینا بھی چندے (یا قیمت) کے ساتھ مشروط ہوسکتا ہے اور مدرسہ میں تعلیم بھی چندے (یا فیس) کے ساتھ مشروط ہوسکتی ہے جو معاوضہ ہے۔

لیکن صمدانی صاحب نے اس جواب سے اعراض کیا تا کہ وہ عقد معاوضہ کے چکر میں نہ پھنس جائیں کیونکہ پانی اور تعلیم تو روپے کے عوض میں ہوسکتے ہیں لیکن انشورنس کا کلیم تو خود روپوں میں ہوتا ہے اور روپوں کے معاوضہ میں کمی بیشی سود ہے۔

ii- یا وہ یہ کہتے کہ جب وقف میں اتنی گنجائش نہیں تو جیسے مدرسہ میں طلبہ کی تعداد ایک حد تک ہی ہوسکتی ہے اسی طرح چندے کی شرط کے بغیر کسی مخصوص علاقہ کے لوگوں کو اس کی سہولت مہیا کی جاتی یا پہلے رابطہ کرنے والے سو افراد کو وقف سے فائدہ پہنچایا جاتا۔

لیکن صمدانی صاحب نے اس جواب کو بھی اختیار نہیں کیا کیونکہ اس طرح تکافل کمپنی کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

اس لئے صمدانی صاحب نے اپنے دعوے پر جو اشکال ظاہر کیا اس کے جواب میں بھی صرف دعوے کو ذکر کر دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ''وقف کو تبرع کے طور پر رقم دینے والا اسی طرح پول سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح مدرسہ یا قبرستان کو چندہ دینے والا'' اور اس پر ہونے والے اشکال کا جواب یہ دیا کہ وقف کرنے والا چندے کی شرط

لگا سکتا ہے۔ لہٰذا صرف وقف کو چندہ دینے والا ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ واقف کے شرط لگانے سے ہی شرط وجود میں آتی ہے اور انتفاع مشروط بنتا ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ ممثل مشروط نہیں ہے جبکہ ممثل لہ مشروط ہے حالانکہ ممثل کو بھی مشروط کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے جواب سے صمدانی صاحب نے کنی کترالی ہے۔

2- صمدانی صاحب کے یہ الفاظ

''اس وقف سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس وقف کو عطیہ دیں۔''

اس پر واضح دلیل ہیں کہ یہ عقد معاوضہ (Commutative deal) ہے کیونکہ وقف فنڈ اور پالیسی ہولڈر آپس میں عوض کے طور پر لین دین کرتے ہیں اور

i- عقود میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے الفاظ کا نہیں۔

ii- وقف شخص قانونی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ ''تم مجھے چندہ دو گے تو حادثہ کی صورت میں میں تمہیں تلافی کی رقم دوں گا۔ اور تھوڑا چندہ دو گے تو تھوڑی تلافی کروں گا زیادہ دو گے تو زیادہ کروں گا۔''

اگر مولانا تقی عثمانی مدظلہ اور صمدانی صاحب اس پر اصرار کریں کہ چندہ تو ہدیہ و عطیہ ہے اس میں عوض کا معنی نہیں اور پالیسی ہولڈر کے نقصان کی تلافی وقف کی شرط کی وجہ سے ہے تو یہ عجیب چکر ہے۔ ان کی بات اس وقت تو متصور ہو سکتی ہے جب کوئی محض نیکی کا کام سمجھ کر وقف فنڈ میں چندہ دے اور تکافل یا انشورنس کا اس کو کچھ پتہ نہ ہو یا اس کا اس سے آئندہ انتفاع کا واقعی کچھ ارادہ نہ ہو۔ پھر اتفاق سے حادثہ کی صورت میں اس کو تکافل کمپنی نے یا کسی اور نے بتایا کہ تم تو فلاں وقف فنڈ سے نقصان کی تلافی کے حقدار ہو۔ لیکن جہاں پہلے ہی باہمی معاملہ کے سارے شرائط وضوابط طے کیے جاتے ہوں اور کوئی بھی عوض کے لالچ یا توقع کے بغیر تکافل کمپنی کے دفتر میں قدم

نہ رکھتا ہو اور پوری لکھت پڑھت کی جاتی ہو وہاں اس قسم کے حیلے بہانے معاملہ کی حقیقت کو نہیں بدلتے ورنہ تو معاشیات کے اس انتہائی ترقی یافتہ دور کے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ معاشیات میں اسلام کے پاس سوائے حیلے بہانوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

دوسرا اشکال

صمدانی صاحب لکھتے ہیں ''وقف کا یہ طریقہ بھی ہے کہ جو زیادہ عطیہ دے (یعنی زیادہ پریمیم دے) وہ اس شخص سے زیادہ نقصان کی تلافی کا حقدار ٹھہرتا ہے جو اس کے مقابلے میں کم عطیہ دے کہ وہ کم نقصان کی تلافی کا حقدار ٹھہرتا ہے گویا عطیہ (پریمیم) کی کمی اور زیادتی کی بنیاد پر نقصان کی تلافی میں کمی زیادتی کرنا اسے عقد معاوضہ کے قریب کر دیتا ہے۔'' (تکافل 102)

صمدانی صاحب کا جواب

پالیسی ہولڈرز تبرع (عطیہ) کے طور پر وقف پول میں جو رقوم جمع کرائیں اس میں کمی زیادتی کی بنیاد پر کم یا زیادہ نقصان کی تلافی اگر پالیسی ہولڈر کا قانونی حق نہ ہو بلکہ وقف کی طرف سے صرف وعدہ ہو تو پھر یہ معاملہ بلاشبہ عقد معاوضہ میں داخل نہیں اس لئے کہ عقد معاوضہ میں ہر فریق کو اپنا معاوضہ لینے کا حق حاصل ہوتا ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ (تکافل ص 103)

ہم کہتے ہیں

تکافل کمپنی کے وقف فنڈ کی شرائط میں یہ بات گزر چکی ہے کہ وقف سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس وقف کو چندہ و عطیہ دیں گے۔ اور ضابطہ ہے کہ

شرط الواقف کنص الشارع یعنی واقف کا شرط لگانا ایسا ہے جیسے شارع کا فرمان (تکافل ص 100) جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہے کہ واقف کی شرط کو قانونی حیثیت حاصل ہے محض اخلاقی نہیں اور اس کی بنیاد پر چندہ و پریمیم ادا کرنے والے وقف سے فائدہ اٹھانے کے قانونی حقدار ہوئے اور وہ قانونی بنیادوں پر اپنا حق وصول کر سکتے ہیں۔

جناب صمدانی صاحب بھی ان کے قانون حق کے احتمال کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس صورت میں وہ عجیب تاویل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''لیکن اگر تبرع کی کمی اور زیادتی کی بنیاد پر نقصان کی تلافی میں کمی اور زیادتی پالیسی ہولڈرز کا قانونی حق ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر اس بنیاد پر اپنے قانونی حق کا دعویٰ کرے کہ اس نے فلاں وقت وقف پول کو اتنی رقم کا پریمیم دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے نقصان کی تلافی کرنا وقف کے ذمہ لازم ہے۔ یہ صورت یقیناً ناجائز ہے کیونکہ یہ بات اسے عقد معاوضہ میں داخل کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ ساری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو کمرشل انشورنس میں موجود ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر اپنے دیئے گئے تبرع کی بنیاد پر نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہ کرے بلکہ وقف کے اپنے طے شدہ قواعد وضوابط کو بنیاد بنا کر اس بات کا دعویٰ کرے کہ میں ان قواعد کی بنیاد پر وقف کی طرف سے تلافی نقصان کا حقدار ہوں...... پالیسی ہولڈر شرعا اس طریقے پر اپنا قانونی حق استعمال کر سکتا ہے اور اس کا یہ قانونی حق اس صورت کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔ (تکافل ص 105, 104)

صمدانی صاحب کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر کا اگر قانونی حق

بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس کے استعمال کا مذکورہ دوسرا طریقہ جائز ہے جو معاوضہ کے مفہوم سے خالی ہے۔

ہم کہتے ہیں

جب واقف کی شرائط کو قانونی حیثیت حاصل ہے اور پالیسی لینے کو بھی قانونی حیثیت حاصل ہے تو یہ کہنا بھی درست ہے کہ وقف پر لازم ہو جاتا ہے کہ شرط پوری ہونے پر وہ پالیسی ہولڈر کے نقصان کی تلافی کرے۔ اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ پالیسی ہولڈر کو عقلاً و شرعاً حق ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی طریقے سے اپنا قانونی حق حاصل کرے خواہ صمدانی صاحب کی ذکر کردہ پہلی صورت سے یا ان کی ذکر کردہ دوسری صورت سے۔

اس کا بیان یہ ہے کہ واقف کی شرائط کا تعلق دو چیزوں سے قائم ہوا ہے ایک پالیسی ہولڈر کے چندہ یا پریمیم ادا کرنے سے اور دوسرا وقف کی طرف سے تلافی نقصان سے۔ اس لئے پالیسی ہولڈر کو اختیار ہے کہ وہ ان دو میں سے کسی بھی تعلق کا حوالہ دے کر تلافی کا مطالبہ کرے۔ غرض وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں نے فلاں وقت وقف پول کو اتنی رقم کا پریمیم دیا تھا جس کی وجہ سے میرے نقصان کی تلافی کرنا وقف کے ذمہ لازم ہے اور یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وقف کے قواعد وضوابط کی بنیاد پر میں نقصان کی تلافی کا حقدار ہوں اور دونوں صورتوں میں وقف فنڈ اور پالیسی ہولڈر کے درمیان معاملہ کے عقد معاوضہ ہونے میں کچھ اشکال نہیں رہتا۔

معاملہ کے عقد معاوضہ ہونے پر مندرجہ ذیل دو باتیں بھی واضح دلیل ہیں۔

i- چندے کی کمی وزیادتی کی بنیاد پر نقصان کی تلافی کی کمی وزیادتی۔

ii- پریمیم ادا کرتے وقت پالیسی ہولڈر کی یہ نیت ہوتی ہے کہ اسے اس کے

بدلے کچھ نہ کچھ ملے بلکہ اگر اس کا نقصان زیادہ ہو تو زیادہ ملے۔ اور اس پر کھلا قرینہ یہ ہے کہ خواہ اسلامی انشورنس ہی ہو آدمی اسی غرض سے کراتا ہے اور ساری لکھت پڑھت کرتا ہے کہ اس کے نقصان کی تلافی ملے۔

صمدانی صاحب کا اس کے عقد معاوضہ ہونے سے انکار کرنا اور انکار کرنے کی وجہ

صمدانی صاحب معاملہ کے عقد معاوضہ ہونے کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وقف کو چندہ دینا ایک مستقل معاملہ ہے اور وقف کے قواعد کے مطابق چندہ دینے والے کا نقصان کی تلافی کرانے کا حقدار ٹھہرنا بالکل دوسرا معاملہ ہے۔'' (تکافل ص 106)

عقد معاوضہ کی نفی کرنے کی خاطر صمدانی صاحب پالیسی ہولڈر اور وقف فنڈ کے درمیان معاملات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس فنڈ کے اندر وہ (یعنی پالیسی ہولڈرز) اس لئے رقم جمع کرا رہا ہوتا ہے کہ اس پول میں موجود افراد (یعنی دیگر پالیسی ہولڈرز) میں سے اگر کسی کو مالی نقصان ہو تو اس کی رقم کو بھی اس نقصان کے پورا کرنے کیلئے استعمال کیا جا سکے اور مجموعی طور پر اگر اسے بھی کوئی نقصان ہو تو دوسرے شرکاء بھی اس پر تیار ہیں کہ ان کے پریمیم سے اس کا نقصان پورا کیا جائے لیکن یہ شرط نہیں کہ میں اس لئے پریمیم دے رہا ہوں کہ میرا نقصان پورا کیا جائے کیونکہ مجھے نقصان ہونے کا یقین نہیں اور نہ ہی دوسرے افراد کو یقین ہے بلکہ نقصان کے احتمال کی بنیاد پر یہ رقم جمع کی جا رہی ہے'' (تکافل ص 114)

''پالیسی ہولڈر کے نقصان کو پورا......کرنے کی ذمہ داری پالیسی ہولڈر کے تبرعات سے وجود میں آنے والے حوض (پول) پر ہوتی ہے۔ (تکافل) کمپنی یہ کہتی ہے کہ یہ پول تمہارا نقصان پورا کرے گا اگر اس کے اندر نقصان پورا کرنے کی گنجائش ہوئی تو آپ کے نقصان کی تلافی کر دی جائے گی اور اگر پول کے اندر گنجائش نہ ہوئی تو یہ نقصان پورا نہیں کیا جائے گا (تکافل ص 115)

ہم کہتے ہیں

صمدانی صاحب کی یہ بات کئی وجوہ سے محل نظر ہے۔

1- صمدانی صاحب نے پالیسی ہولڈر کے رقم جمع کرانے کی جو تاویل کی ہے وہ محض ان کی اختراع ہے جو ان کی دیگر تصریحات کے خلاف ہے۔اس بات کی تصریح پہلے گزر چکی ہے کہ پالیسی ہولڈر کی جمع کرائی ہوئی رقم وقف فنڈ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر کا اب اس رقم سے کوئی تعلق نہیں رہا اور اب وقف فنڈ پر ہے کہ وہ اس کو اپنے قواعد وضوابط کے مطابق خرچ کرے۔لیکن صمدانی صاحب اس کو وقف فنڈ کے ملکیتی ہونے کے بجائے اس کے پاس امانت ہونے کو بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں ''اس پول میں موجود افراد میں سے اگر کسی کو مالی نقصان ہو تو اس کی رقم کو بھی اس نقصان کے پورا کرنے کیلئے استعمال کیا جا سکے'' حالانکہ اب وہ اس کی رقم تو رہی نہیں۔اسی طرح وہ یہ بھی لکھتے ہیں ''امانت کا عقد جس کی وجہ سے پالیسی ہولڈر کی رقم کمپنی کے پاس (یا وقف فنڈ کے پاس) بطور امانت آ جاتی ہے'' (تکافل ص 114)

2- تکافل کمپنی کے ساتھ پالیسی ہولڈر جو بھی معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت ایک

مکمل معاملہ ہے یعنی یہ کہ پالیسی ہولڈر یہ معلوم کر کے کہ وقف فنڈ سے اس کے موہوم نقصان کی تلافی ملتی ہے وہ اس کے لالچ میں تکافل کمپنی سے یکبارگی مکمل معاملہ کرتا ہے۔ لیکن صمدانی صاحب اس معاملہ کے حصے بخرے کرتے ہیں اور ہر حصہ کی علیحدہ علیحدہ تاویل کر کے اس کو سیدھا دکھانے کے در پے ہیں۔

3- اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ وقف فنڈ خود ایک شخص قانونی ہے اور وقف فنڈ کو جو چندہ دیا جائے وہ اس کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے تو صمدانی صاحب کی مذکورہ بالا عبارتوں کا حاصل یہ ہوگا کہ وقف فنڈ زید سے کہتا ہے کہ تم مجھے اتنا چندہ دو تو میں بشرط موجودگی وسائل تمہارے ممکنہ نقصان کی تلافی کروں گا اور زید یہ جانتے ہوئے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کا نقصان ہو اور ہوسکتا ہے کہ نہ ہو اور یہ بھی جانتے ہوئے کہ وقف فنڈ کی ملکیت میں تلافی کیلئے رقم ہوسکتا ہے ہو اور ہوسکتا ہے نہ ہو چندے کی رقم وقف فنڈ میں جمع کراتا ہے۔

صمدانی صاحب کی اس بات کا خلاصہ نکالیں تو یہ نکلے گا کہ زید موہوم تلافی کی خاطر وقف فنڈ کو چندہ دیتا ہے۔ یہ بات عقد معاوضہ ہونے کے منافی بھی نہیں اور علاوہ ازیں قمار ہونے پر بھی صریح دلیل ہے۔

4- ایک اور پہلو جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر کی جانب سے وقف فنڈ کو عطیہ و چندہ دیا جاتا ہے لیکن شرط فاسد کے ساتھ یعنی موہوم تلافی کی شرط کے ساتھ۔ اب کوئی کہے کہ ہدیہ و چندہ شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتا بلکہ خود شرط باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ ہوتا ہے کہ چندہ دینے کی بالکل مستقل اور غیر مشروط حیثیت بن جاتی ہے اس لئے پالیسی ہولڈر اس کی بنیاد پر تلافی نقصان کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اور وقف فنڈ کی جانب سے نقصان ایک بالکل الگ اور مستقل معاملہ ہے جو واقف کی شرائط کے تحت ہے۔

ہم کہتے ہیں اتنی بات تو درست ہے کہ پالیسی ہولڈر کا دیا ہوا چندہ شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوگا۔اور وہ موہوم تلافی کا حقدار نہیں ہوگا۔لیکن اگر وہ اس کے باوجود نقصان کی تلافی وصول کرتا ہے تو اب یہ سارا معاملہ ایک ہو کر فاسد ہو جائے گا جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جب زید بکر کو کہے کہ میں تمہیں ایک ہزار روپے کا قرض اس شرط سے دیتا ہوں کہ تم مجھے اس کے گیارہ سو واپس کرو گے۔بکر نے ایک ہزار روپیہ وصول کرلیا۔اس حد تک تو معاملہ صحیح ہوگا اور شرط فاسد خود باطل ہو جائے گی لیکن اگر بکر نے گیارہ سو واپس کیئے اور زید نے وہ قبول کر لئے تو یہ سب معاملہ ایک ہو کر سود کا ہو جائیگا اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ زید کا قرض دینا بھی درست ہوا اور چونکہ شرط فاسد باطل ہو گئی تھی لہٰذا بکر نے جو سو روپے زائد واپس کیئے وہ اس شرط کے تحت نہیں آتے بلکہ وہ ایک نیا ہبہ ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر اور وقف فنڈ کے درمیان عقد معاوضہ واقع ہوتا ہے اور تکافل یا اسلامی انشورنس کے تحت یہ معاملہ سود، قمار اور غرر پر مشتمل ہے۔

تکافل سے ہٹ کر مروجہ انشورنس میں بھی یہی تین خرابیاں جو خود صمدانی صاحب یوں ذکر کرتے ہیں۔

”مروجہ انشورنس کے اندر بنیادی طور پر تین خرابیاں موجود ہیں۔

1- ربا (Interest)

2- قمار (Gambling)

3- غرر (Uncertainty) (تکافل ص 120)

صمدانی صاحب چونکہ تکافل کے عقد تبرع ہونے پر پختہ ہیں اس لئے وہ اس کو ہر مرض کی دوا سمجھتے ہیں اور لکھتے ہیں:

مروجہ انشورنس میں ہونے والا معاملہ عقد معاوضہ تھا جس کی وجہ سے

درج بالا خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اسلامی انشورنس میں اسے عقد تبرع میں تبدیل کر دیا گیا جس سے ربا (سود) کی خرابی تو بالکل ختم ہوگئی کیونکہ سود اسی صورت میں پایا جاتا ہے جب دو چیزوں کی تبدیلی عقد معاوضہ کی بنیاد پر ہو۔ جب معاملہ معاوضہ کی بنیاد پر نہ ہو بلکہ کوئی شخص اپنی طرف سے تبرعاً زیادہ دے دے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ شرعاً پسندیدہ ہے مثلاً کسی شخص نے آپ کو سو روپے ہدیے کے طور پر دیئے۔ پھر کسی موقع پر آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تو آپ نے دوسو روپے ہدیے کے طور پر دے دیئے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہوگا اور اسے ربا نہیں کہا جائے گا کیونکہ اس نے آپ کو سو روپے اس شرط پر نہیں دیئے تھے کہ آپ اسے کچھ بڑھا کر واپس کریں گے......

باقی دو خرابیاں غرر اور قمار کی ہیں۔ ان دونوں کی بنیاد غیر یقینی کیفیت (Uncertainty) پر ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر یقینی کیفیت تکافل کے اندر بھی موجود ہے کیونکہ اس میں پالیسی ہولڈر ایک ایسے نقصان کی تلافی کیلئے پریمیم جمع کراتا ہے جس کا پایا جانا غیر یقینی ہے کہ یہ معلوم نہیں کہ پالیسی ہولڈر کو وہ نقصان پیش آئے گا یا نہیں؟

لیکن اسلامی تکافل کے اندر اس غیر یقینی کیفیت سے عقد ناجائز نہیں ہوتا کیونکہ اس کی بنیاد عقد تبرع پر ہے اور تبرعات کے اندر غیر یقینی کیفیت (Uncertainty) کا پایا جانا ممنوع نہیں جبکہ عقود معاوضہ کے اندر ممنوع ہے۔

اس کو بذریعہ مثال یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ مثلاً میرے پاس ایک تھیلی میں کچھ رقم ہے میں کسی دکاندار سے ایک پنکھا خریدتا ہوں اور اس سے

کہتا ہوں کہ اس کی قیمت وہ رقم ہے جو اس تھیلی میں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ دکاندار کو معلوم نہیں کہ اس میں کتنی رقم ہے لہٰذا اس کے اعتبار سے قیمت مجہول (غیر معلوم) ہے اور بیع کے صحیح ہونے کیلئے ضروری ہے کہ بیچی جانے والی چیز کی قیمت فریقین کو معلوم ہو، لیکن اگر میں کسی طالب علم سے یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ امتحان میں اول آ گئے تو جو رقم اس تھیلی میں ہے وہ تمہیں انعام کے طور پر دوں گا تو یہ صورت جائز ہے حالانکہ یہاں بھی جہالت اور غیر یقینی کیفیت (Uncertainty) موجود ہے لیکن چونکہ یہ عقد تبرع ہے اس لئے یہاں جہالت اور غیر یقینی کیفیت (Uncertainty) کا پایا جانا ممنوع نہیں۔ اس طرح جب ہم نے انشورنس کا ڈھانچہ بدل دیا تو یہاں پر بھی غیر یقینی کیفیت پائے جانے کے باوجود معاملہ ناجائز نہیں ہوگا۔" (تکافل ص 122 ,121)

ہم کہتے ہیں

صمدانی صاحب نے یہاں بھی وہی کام کیا ہے کہ معاملہ کے حصے بخرے کیئے اور پھر ہر حصہ کی جائز ہونے کو مثال سے ذکر کر دیا۔ معاملہ کی جو مجموعی صورت ہے اس پر نظر کرنے پر وہ آمادہ ہی نہیں ہیں حالانکہ یہاں اصل تو مجموعی صورت ہی ہے۔

دیکھیئے صمدانی صاحب نے تبرع کی یہ مثال دی ہے کہ کسی شخص نے آپ کو سو روپے ہدیے کے طور پر دیے، پھر کسی موقع پر آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تو آپ نے دو سو روپے ہدیے کے طور پر دیے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہوگا۔ اس مثال سے صمدانی صاحب نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تکافل میں بھی تبرع ہوتا اس لیے وہ جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ صمدانی صاحب کی یہ مثال تکافل کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کی مثال تو یوں بنتی ہے کہ زید بکر سے کہے کہ اگر تم مجھے سو روپے ہدیہ کرو گے تو وسائل کے ہونے کی صورت میں کبھی تمہیں ضرورت پڑی تو میں تمہیں دس ہزار روپے دوں گا۔ اس کو کون محض عقد تبرع کہے گا اور عقد معاوضہ نہ سمجھے گا پھر جب کہ وقف فنڈ اور تکافل کمپنی قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے قواعد وضوابط اور اغراض ومقاصد کو قانونی حیثیت حاصل ہے تو یہ اور پختہ عقد معاوضہ بنے گا۔

عملی خرابیاں

1- کمپنی خود ہی رب المال اور خود ہی مضارب بنتی ہے۔

تکافل کمپنی لکھتی ہے۔

The Company shall act as a Mudarib for the purpose of managing the investment of Participant's contribution. As such, the Company stands entitled to a share in the investment income there of as Mudarib.

ترجمہ: شریک یعنی پالیسی ہولڈر کے چندے سے حاصل ہونے والے سرمایہ میں تکافل کمپنی مضارب کی حیثیت سے کام کرے گی اور اس طرح سے حاصل ہونے والے نفع میں مضارب کی حیثیت سے حصہ دار ہوگی۔

ہم کہتے ہیں

کمپنی جو خود واقف بھی ہے اور متولی بھی ہے وہ خود مضارب نہیں بن سکتی کیونکہ

مضاربت دو فریقوں کے درمیان ایسا عقد ہوتا ہے جس میں ایک کی جانب سے مال ہوتا ہے اور دوسرے کی جانب سے عمل ہوتا ہے۔ چونکہ کمپنی وقف فنڈ کی متولی ہے لہٰذا وہ رب المال ہے اور وہ مضارب نہیں بن سکتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ کمپنی تو پالیسی ہولڈروں کے سرمایہ میں مضارب کے طور پر کام کرتی ہے لہٰذا رب المال تو پالیسی ہولڈر ہوئے۔ تو یہ صحیح نہیں کیونکہ اوپر یہ ذکر ہو چکا ہے کہ پالیسی ہولڈر جو چندہ دیتے ہیں وہ وقف کی ملکیت ہوتا ہے اور کمپنی اس کی بھی متولی ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں کمپنی نے وقف فنڈ کے لئے جو سرمایہ فراہم کیا ہے اس میں بھی تو کمپنی ہی مضاربت کے طور پر کام کرے گی تو کمپنی خود ہی رب المال اور خود ہی مضارب بنی جو صحیح نہیں۔

اس کے جواب کے طور پر مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں

والظاهر انه لا مانع من كونها متولية للوقف و مضاربة فى اموالها فى وقت واحد بشرط ان تكون المضاربة بعقد منفصل و بنسبة من الربح لا تزيد عن نسبة ربح المضارب فى السوق فان الفقهاء اجازوا لناظر الوقف ان يستاجر ارض الوقف باجرة المثل عند بعضهم و بما يـزيد على اجرة المثل عند آخرين (الفتاوى الهندية ج 2 ص 421) فيمكن ان تقاس عليه المضاربة و ان لم أره فى كلام الفقهاء بصراحة.

ترجمہ: ظاہر یہ ہے کہ کمپنی ایک ہی وقت میں وقف فنڈ کی متولی بھی ہو اور اس کے اموال میں مضارب بھی ہو اس سے کوئی مانع نہیں ہے جبکہ ایک تو مضاربت کا عقد جدا ہوا ہو اور دوسرے کمپنی کا نفع میں حصہ مارکیٹ ریٹ سے زیادہ نہ ہو کیونکہ فقہاء نے وقف کے ناظر کیلئے جائز بتایا ہے کہ وہ وقف کی زمین کو خود اجرت مثل یا اس سے زائد

کے عوض کرایہ پر لے لے۔اس پر مضاربت کو قیاس کیا جا سکتا ہے اگرچہ اس کی تصریح مجھے فقہاء کے کلام میں نہیں ملی۔

ہم کہتے ہیں

یہ بات غور طلب ہے کہ فقہاء نے ناظر کیلئے وقف زمین کو اجرت پر لینے کے جواز کی تصریح کی اور ناظر کے مضارب بننے کے جواز کی تصریح نہیں کی۔ آخر ان دونوں میں کچھ فرق ہوگا تب ہی تو فقہاء نے بظاہر فرق رکھا ہے

اور وہ فرق یہ ہے کہ وقف اراضی کوئی غصب کر لے تو اگرچہ وہ اجرت پر دینے کے لئے نہ ہو تب بھی غاصب کو اس کی اجرت مثل دینی ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر ناظر یا متولی وقف کی اراضی کو خود اجرت پر لے لے تو اگرچہ وہ معروف طریقے پر اجارہ نہیں ہے لیکن اجرت مثل واجب ہونے سے اس معاملہ کو مجازاً اجارہ کہہ دیا۔مضاربت میں حقیقی یا مجازی کوئی بھی صورت نہیں بنتی اس لئے مضاربت کو اجارہ پر قیاس کرنا ممکن نہیں ہے۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ بھی اس قیاس پر پوری طرح مطمئن نہیں ہیں اس لئے وہ ایک متبادل صورت بھی بتاتے ہیں اگرچہ تکافل کمپنی نے عملاً پہلی ہی صورت کو اختیار کیا ہے۔مولانا مدظلہ متبادل صورت یہ لکھتے ہیں:

ولئن کان هناک شک فی جمع الشرکة بین تولیة الوقف و بین المضاربة فیمکن ان یکون احد مدیری الشرکة او احد موظفیه متولیا للوقف بصفته الشخصیة ویستاجر الشرکة لادارة الصندوق باجر و یدفع الیها الاموال للاستثمار علی اساس المضاربة.

ترجمہ: اگر کمپنی کے بیک وقت متولی وقف ہونے اور مضارب ہونے میں کچھ شک ہو تو جو متبادل صورت ممکن ہے وہ یہ ہے کہ کمپنی کے ڈائریکٹروں یا منیجروں میں

سے ایک اپنی ذاتی شخصیت کے اعتبار سے وقف کا متولی ہو جائے اور وہ وقف فنڈ کے انتظام کیلئے کمپنی کو اجرت پر لے لے اور وقف کے اموال بھی مضاربت کی بنیاد پر کمپنی کے حوالے کر دے۔

ہم کہتے ہیں

یہ تو پہلے سے بدتر صورت ہے اور آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کا مصداق ہے کیونکہ۔

مولانا مدظلہ لکھ چکے ہیں کہ **تنشئ شركة التامين الاسلامی صندوقا للوقف و تعزل جزءا معلوما من راس مالها يكون وقفا** (اسلامی انشورنس کمپنی اپنے سرمایہ کے ایک حصہ سے وقف فنڈ قائم کرتی ہے) جس کا مطلب ہے کہ پہلے کمپنی قائم ہوتی ہے اور وہ اپنے سرمایہ سے وقف فنڈ کو قائم کرتی ہے۔

پھر مولانا مدظلہ کے بقول کمپنی ایک قانونی شخص ہے جس میں ڈائریکٹران کی ذاتی شخصیت گم ہو جاتی ہے اور تمام حقوق و ذمہ داریوں کی نسبت کمپنی کے قانونی شخص کی طرف کی جاتی ہے۔ لہذا کوئی ڈائریکٹر کمپنی کا جو بھی کام کرے گا اس کو درحقیقت کمپنی ہی کا کرنا کہیں گے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ کمپنی وقف فنڈ قائم کر کے واقف بن گئی۔

اب مولانا کہتے ہیں کہ ایک ڈائریکٹر اپنی ذاتی شخصیت کے اعتبار سے وقف فنڈ کا متولی بن جائے۔ لیکن جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جب کمپنی کے کام کے اعتبار سے ڈائریکٹر کی ذاتی شخصیت کمپنی میں گم ہے اور اس کا کرنا کمپنی کا کرنا ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ واقف بننے کے بعد کمپنی اپنے آپ کو ایک نئے معاملہ کے ساتھ متولی بناتی ہے۔ پھر مولانا مدظلہ کی اس تجویز کے مطابق کمپنی ہی خود سے انتظام کیلئے اجرت پر

معاملہ بھی کرتی ہے اور سرمایہ کاری کیلئے مضاربت کا معاملہ بھی کرتی ہے۔ غرض مولانا مدظلہ کی باتوں سے وہی الزام ثابت ہوا جو ہم نے ان پر عائد کیا تھا کہ مولانا نے کمپنی کو رب المال اور مضارب دونوں ہی بنا دیا جو جائز نہیں۔

2- وقف یا اس کی ملکیت کو ختم کرنا

تکافل کمپنی کہتی ہے

This Policy may at any time be terminated at the option of the Company on 14 days' notice to that effect being given to the Participant............ In that case, the Participant shall be given an amount equivalent to a rateable proportion of the contribution for the unexpired Period of policy from the date of such cancellation. This policy may aslo be terminated at any time at the request of the Participant, in which case the Participant will be paid an amount equivalent to the actual contribution made initially by him / her, less the amount worked as per the following scale.

ترجمہ: یہ تکافل پالیسی کمپنی کے اختیار پر کسی بھی وقت 14 دن کے

نوٹس پر ختم کی جاسکتی ہے......اس صورت میں پالیسی ہولڈر کو بقیہ مدت کی نسبت سے چندے کی جتنی رقم بنتی ہے واپس کی جائے گی۔ پالیسی ہولڈر کی درخواست پر بھی یہ پالیسی ختم کی جاسکتی ہے اور اس صورت میں دیئے گئے سکیل کے مطابق جتنی رقم بنتی ہے وہ منفی کر کے اس کے چندے کی باقی رقم واپس کی جائے گی۔

ہم کہتے ہیں کہ

چندے کی رقم وقف کی ملکیت ہے اور شریعت کی رو سے اس کی مالک کو واپسی جائز نہیں نہ کل کی نہ جزو کی۔ اس رقم کو وقف رقم کے نفع کی طرح صرف وقف کے مصالح و مقاصد میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ایسی کوئی صورت متصور نہیں ہے کہ متولی وقف کی ملکیت مالک کو واپس کر دے یا چندہ دہندہ اس کو واپس لے لے۔

مسئلہ:5

مروجہ اسلامی بینکاری کی چند خرابیاں

بسم اللہ حامدا و مصلیا.

اس دور میں مولانا تقی عثمانی مدظلہ اوران کے صاحبزادے مولوی عمران اشرف عثمانی سلمہ کی کوششوں سے پاکستان میں اسلامی بینکاری کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح الحمدللہ ہم بھی اسلامی بینکاری کے خواہش مند ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ نظام خالص اسلامی ہو اوراس میں سود کی اور دیگر غیر اسلامی امور کی آمیزش نہ ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں رائج کردہ اسلامی بینکاری نظام نہ سو فیصد اسلامی ہے اور نہ ہی سو فیصد سود سے پاک ہے۔ جس کا یہ فائدہ تو ہے کہ جو لوگ پہلے سو فیصد سود میں ملوث تھے وہ اگر اپنے مالی معاملات اور بینکوں کو چھوڑ کر صرف اسلامی بینک سے کریں تو وہ مثلاً چالیس فیصد سود پر آجائیں گے لیکن دوسری طرف اس سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دینداری اور اپنی احتیاط کی وجہ سے سود وغیرہ کے صفر درجہ (Zero Level) پر تھے وہ لامحالہ سود کے چالیس فیصد لیول پر آجائیں گے اور یقیناً یہ ایک بڑا نقصان ہے۔

مولوی عمران اشرف عثمانی نے انگریزی میں

Meezan Bank's Guide to Islamic Banking

یعنی ''اسلامی بینکاری کے لئے میزان بینک کی راہنما'' نامی کتاب لکھ کر شائع کی اور دارالعلوم کراچی کے استاد مولانا ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی نے اپنی کتاب ''اسلامی بینکاری۔ ایک حقیقت پسند جائزہ'' شائع کی۔ ان کی بنیاد پر ہم نے اس بینکاری کی درج ذیل چند خرابیاں لکھی ہیں۔

1- شرح سود کو معیار بنایا جاتا ہے۔

کسی شے کی قیمت یا کرایہ طے کرنے کے لئے مروجہ اسلامی بینک ایک متبدل (Floating) ریٹ ذکر کرتے ہیں جس میں بنیادی اہمیت Kibor یعنی Karachi Inter Bank Offered Rate کو حاصل ہوتی ہے جو کہ بینکوں کے آپس کے لین دین کی شرح سود ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس شرح سود کی بنیاد پر قیمت یا کرایے کی تعیین کی جائے گی اور اس کی تبدیلی سے قیمت یا کرایہ بدلتا رہے گا۔ اس میں دو خرابیاں ہیں۔

i- قیمت یا کرایہ کے طے کرنے میں شرح سود کو معیار بنانے اور اس کو ذکر کرنے میں اسلام کے غیر سودی نظام سے مناسبت نہیں ہے۔

ii- اس سے یہ بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی وقت اسلامی بینک کو سرمایہ کی ضرورت ہو تو وہ بھی دوسرے بینکوں سے قرض لیتا ہے اور ان کو Kibor کے حساب سے سود ادا کرتا ہے۔

دارالعلوم کراچی کے مدرس مولانا ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی اس بارے میں جو صفائی پیش کرتے ہیں وہ ہمارے اسی اندیشہ کی تائید کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمیں اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہئے کہ موجودہ حالات میں

اسلامی بینک شرح سود کو کیوں معیار بناتے ہیں اور اس کا متبادل تلاش کرنے میں انہیں فی الحال کن مشکلات کا سامنا ہے۔

بینکوں کے باہمی شرح سود کا پس منظر یہ ہے کہ عام طور پر مختلف بینک ایک جیسے حالات میں نہیں چل رہے ہوتے، بعض بینک ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس ضرورت سے زائد رقم ہوتی ہے جب کہ بعض بینکوں کے پاس فنانس کے لئے رقم کم ہوتی ہے تو جن بینکوں کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان بینکوں سے قرضہ لیتے ہیں جن کے پاس رقم زائد ہوتی ہے۔قرضہ دینے والا بینک ایک مخصوص شرح سود پر قرض دیتا ہے اسے Inter Bank offered rate کہا جاتا ہے یعنی بینکوں کے باہمی معاملات میں پیش کیا گیا شرح سود۔اس کا مخفف Ibor ہے۔ پاکستان میں عام طور پر کراچی کے بینکوں کا شرح سود بطور پیمانہ استعمال ہوتا ہے جسے کائبور یعنی Karachi Inter Bank Offered Rate کہتے ہیں۔

اگر پاکستان میں اسلامی بینک کائبور کو چھوڑ کر کوئی اسلامی معیار بنانا چاہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے اسلامی بینکنگ کی ایک بڑی مارکیٹ کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ الحمدللہ پاکستان میں بھی آہستہ آہستہ یہ مارکیٹ ترقی کر رہی ہے۔" (اسلامی بینکاری ایک حقیقت پسند جائزہ، ص 54)

2-مالی جرمانہ وصول کیا جاتا ہے جو کہ سود ہے

مولوی عمران اشرف عثمانی صاحب ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ بینک اگر کسی کے

ساتھ مرابحہ کا معاملہ کرے تو اس کے بروقت ادائیگی نہ کرنے پر نہ تو قیمت میں تبدیلی کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس سے کوئی جرمانہ وصول کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ بینک کے لئے یہ ہدایت بھی جاری کرتے ہیں کہ وہ گاہک جو ایک ماہ کی مہلت ملنے کے باوجود کسی معقول عذر کے بغیر جان بوجھ کر ادائیگی نہیں کرتا تو اس نے بینک کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کے تدارک کے لئے اس سے اتنی رقم وصول کی جائے۔

دیکھئے عمران اشرف عثمانی صاحب ایک طرف جرمانہ کے ناجائز ہونے کو لکھتے ہیں:

Another issue with Murabahah is that if the client defaults in payment of the price at the due date, the price cannot be changed nor can penalty fees be charged.

مرابحہ میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر گاہک مقررتاریخ پر ادائیگی نہیں کرتا تو نہ تو قیمت تبدیل کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی جرمانہ وصول کیا جاسکتا ہے۔

لیکن پھر دوسرے ہی لمحہ وہ یہ فیصلہ جاری فرماتے ہیں۔

In order to deal with dishonest clients who default in payment deliberately,they should be made liable to pay compensation to Islamic bank for the loss suffered on account of default''. P.129

بددیانت گاہک جو جان بوجھ کر بروقت ادائیگی نہیں کرتے ان کو

مجبور کیا جاسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے اسلامی بینک کو جو نقصان ہوا ہے اس کے تدارک کے لئے کچھ رقم دیں۔

ہم کہتے ہیں

کہ کوئی جناب عمران اشرف صاحب سے پوچھے کہ نقصان کے تدارک کے طور پر لی جانے والی رقم جرمانہ نہیں تو اور کیا ہے اور جرمانہ اس وجہ سے منع تھا کہ وہ سود بنتا تھا لہٰذا بینک تدارک کے نام پر درحقیقت سود وصول کرتا ہے۔

3- کار لیزنگ اور ہوم فنانسنگ میں انشورنس یا تکافل

اسلام کی رو سے انشورنس یقیناً ناجائز ہے اور اس میں سود، جوئے اور غرر کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یہی تینوں باتیں تکافل یعنی اسلامی انشورنس میں بھی پائی جاتی ہیں جیسا کہ تکافل کے بیان میں ہم تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں۔ لہٰذا مروجہ تکافل بھی غیر اسلامی طریقہ ہے۔

کار میں بینک اپنے ہی نام پر انشورنس یا تکافل کراتا ہے اور گھر میں بینک اور گاہک خود اپنے اپنے حصوں کے بقدر کراتے ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل باتیں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں:

i- گاہک جو کار لیزنگ یا ہوم فنانسنگ کرواتا ہے وہ بینک کے انشورنس یا تکافل میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے اور چونکہ اس کو علم ہے کہ بینک ایسا ضرور کرے گا اور محض اس کی وجہ سے کرے گا تو وہ بھی گناہگار ہوتا ہے۔

ii- کار اجارہ سکیم میں میزان بینک کی جاری کردہ Provisional Rental Calculation Sheet (کرایہ کی عبوری تشخیص) میں درج ہے کہ پہلے ماہ کا کرایہ رجسٹریشن اور بار برداری کے اخراجات کو بھی شامل ہے اور باقی مہینوں کے کرائے

انشورنس (یا تکافل) کی رقم کو بھی شامل ہیں مثلا ایک گاڑی جس کی قیمت 3,44,000روپے ہے۔

اس کے پہلے ماہ کا کرایہ 31,487 روپے ہے اور وہ Inclusive of Registration, Rent and Freight chargesہے۔

جب کہ اگلے ہر ماہ کا کرایہ 11,487 روپے ہے اور وہ انشورنس کی رقم سمیت ہے یعنی Inclusive of insuranceہے۔

اگرچہ یہ تشخیص نامہ عبوری (Provisional) ہے لیکن بینک کی دستاویزات میں شامل ہے اور گاہک کو بھی دکھایا جاتا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کار اجارہ میں بینک خود اپنی طرف سے انشورنس کراتا ہے اور خود اپنی طرف سے پریمیم ادا کرتا ہے۔

4- یومیہ سرمایہ کی بنیاد پر نفع کی تقسیم:

(On the basis of daily products)

کھاتہ داروں کو جب اور جتنی بھی رقم ہو جمع کرانے پر آمادہ کرنے کے لئے مروجہ بینکوں نے یومیہ سرمایہ کی بنیاد پر نفع دینے کی سکیم نکالی ہے۔ عمران اشرف صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Many financial institutions finance the working capital of an enterprise by opening a running account for them from where the clients draw different amounts at different intervals, but at the same time, they keep returning their surplus

amounts. Thus the process of debit and credit goes on upto the date of maturity, and the interest is calculated on the basis of daily products. Can such an arrangement be possible under the musharakah or mudarabah modes of financing (Meezan Bank's guide. p: 177)

If such an arrangement is agreed upon between the parties, it does not seem to violate any basic principle of the musharakah. ----practically, it means that the parties have agreed to the principle that the profit accrued to the Musharakah portfolio at the end of the term will be divided based on the average capital utilized per day, which will lead to the average of the profit earned by each rupee per day. The amount of this average profit per rupee per day will be multiplied by the number of days each investor has put his money into the

business, which will determine his profit entitlement on daily product basis." (Meezan Banks' guide p:178)

''بہت سے مالیاتی ادارے کسی کاروباری ادارے کے زیر گردش سرمایہ کواس طریقے سے ترتیب دیتے ہیں کہ اس کا ایک رواں کھاتہ کھول دیتے ہیں جس میں سے عمیل مختلف اوقات میں مختلف رقمیں نکالتے ہیں اور ساتھ ہی فاضل سرمایہ جمع بھی کراتے رہتے ہیں۔ غرض رقمیں جمع کرانے اور نکالنے کا عمل تاریخ انتہا تک چلتا رہتا ہے اور یومیہ بنیادوں پر سود کا حساب لگایا جاتا ہے۔ کیا ایسا معاملہ مشارکہ اور مرابحہ کی سرمایہ کاری میں بھی کیا جا سکتا ہے؟

اگر پارٹیوں کے درمیان ایسے معاملہ پر اتفاق ہو جائے تو اس سے مشارکہ کے کسی بنیادی ضابطہ کی مخالفت نہیں ہوتی۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ پارٹیوں نے اس قاعدہ وضابطہ پر اتفاق کر لیا ہے کہ مشارکہ کے کھاتے میں مدت کے آخر میں جو نفع جمع ہو وہ اس بنیاد پر تقسیم ہوگا کہ اوسطاً فی یوم کتنا سرمایہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے فی یوم فی روپیہ حاصل ہونے والا نفع معلوم ہوگا جس کو ان ایام کے عدد سے ضرب دیں گے جن میں ہر سرمایہ کار نے اپنا سرمایہ کاروبار میں لگایا ہے۔ اس سے یومیہ بنیادوں پر نفع کی تعیین کی جا سکے گی۔''

اس پر عمران اشرف صاحب نے پھر خود ہی ایک اعتراض وارد کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ شراکت میں تو شریکوں کے راس المال کا علم ہوتا ہے جب کہ اس نظام میں کھاتہ دار رقمیں نکالتے اور جمع کراتے رہتے ہیں اس لئے

مشارکہ میں داخل ہوتے وقت ان کے سرمایہ کی مقدار مجہول ہوتی ہے اوراس جہالت سے مشارکہ باطل ہو جاتا ہے پھراس کے جواب میں علامہ کاسانی رحمہ اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جہالت مفضی الی النزاع (جھگڑے کا باعث) نہیں ہے کیونکہ جب سامان خریدا جاتا ہے تو مقدار کا علم ہو ہی جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"But the proposed running account of musharakah where the partners are coming in and going out every day, nobody has undertaken to contribute any specific amount. Therefore the capital contributed by each partner is unknown at the time of entering into Musharakah which should render the musharakah invalid. The answer to the above objection is that the classical scholars of Islamic fiqh have different views about whether it is necessary for a valid Musharakah that the capital is pre-known to the partners. The Hanafi scholars are unaminous on the point that it is not a pre-condition. Al-kasani, the famous hanafi jurist writes:

"According to our hanafi school, it is not a condition for the validity of musharakah that the amount of capital is known, while it is a condition according to Imam Shafi. Our argument is that jahalah (uncertainty) in itself does not render a contract invalid, unless it leads to disputes. And the uncertainty in the capital at the time of musharakah does not lead to disputes, because it is generally known when the commodities are purchased for the musharakah, therefore it does not lead to uncertainty in the profit at the time of distribution." (Meezan Banks' guide: pp. 179-180)

''لیکن مشارکہ کا مجوزہ رواں کھاتہ جس میں شریک روزانہ داخل اور خارج ہوتے رہتے ہیں کوئی بھی شریک اس میں متعین رقم جمع کرانے کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے۔اس لئے مشارکہ شروع کرنے کے وقت ہر شریک کے راس المال (سرمایہ) کی مقدار نامعلوم ہے جس کی وجہ سے مشارکہ فاسد ہو جانا چاہیئے۔

مذکورہ بالا اعتراض کا جواب یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے قدیم محققین کا

اس بارے میں اختلاف رائے ہے کہ مشارکہ کے جواز کے لئے آیا شرکاء کے راس المال کا پہلے سے معلوم ہونا شرط ہے یا نہیں۔ حنفی علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ شرط نہیں ہے۔ مشہور حنفی فقیہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

ہمارے حنفیہ کے مطابق مشارکہ کے جواز کے لئے یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ راس المال کی مقدار معلوم ہو اگرچہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ شرط ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت بذات خود عقد کے لئے موجب فساد نہیں ہوتی بلکہ صرف اسی وقت ہوتی ہے جب وہ نزاع کا باعث بنے۔ اور مشارکہ کے شروع میں راس المال کے بارے میں جہالت نزاع کا باعث نہیں ہوتی کیونکہ (مشارکہ کے تحت) جب سامان خریدا جاتا ہے تو اس کا علم ہو جاتا ہے لہٰذا نفع کی تقسیم میں وہ جہالت کا باعث نہیں ہوتی۔''

ہم کہتے ہیں

ہمیں افسوس ہے کہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی عبارت کا جو مطلب مولوی عمران اشرف صاحب نے بتایا ہے ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکے۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی عبارت یوں ہے:

ولنا ان الجهالة لا تمنع جواز العقد لعينها بل لافضائها الى المنازعة وجهالة راس المال وقت العقد لا تفضى الى المنازعة لانه يعلم مقداره ظاهرا و غالبا لان الدراهم والدنانير توزنان وقت الشراء فيعلم مقدارها فلا يؤدى الى جهالة مقدار الربح وقت القسمة.

(بدائع الصنائع ج 6 ص 63)

''ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت بذات خود عقد کے جواز کے مانع نہیں ہوتی بلکہ مفضی الی المنازعہ ہونے کی وجہ سے مانع ہوتی ہے۔ اور عقد کے وقت راس المال کی مقدار کی جہالت مفضی الی المنازعہ نہیں کیونکہ عام طور سے سامان کی خرید کے وقت چونکہ دراہم ودنانیر کو تولا جاتا ہے اس لئے اس وقت اس کی مقدار معلوم ہوجاتی ہے لہٰذا نفع کی تقسیم کے وقت نفع کی مقدار بھی مجہول نہیں رہتی۔''

علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ عقد کے وقت سرمایہ کی مقدار کا تفصیلی علم ہونا شرط نہیں۔ یہ کہنا کہ عقد کے وقت مقدار کا اجمالی علم بھی شرط نہیں ہے بلا دلیل ہے۔ دیکھئے علامہ رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں کہ خریداری کے وقت چونکہ دراہم ودنانیر کا وزن کیا جاتا ہے تو اس وقت ان کی مقدار کا علم جو کہ تفصیلی علم ہے ہوجاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ وہ دراہم ودنانیر ہیں جو عقد کے وقت سامنے رکھ دیئے گئے کہ ان کے ساتھ مشارکت ہوگی۔ غرض عقد کے وقت دراہم ودنانیر سامنے ہونے کی وجہ سے یا ان کی طرف اشارہ ہونے کی وجہ سے ان کی مقدار کا اجمالی علم تو ضرور ہوا جبکہ یومیہ بنیاد کے مسئلہ میں عقد کے وقت سرمایہ کی مقدار کا نہ تو اجمالی علم ہے اور نہ تفصیلی علم ہے۔

آخر شرکت عنان بالاموال کی حقیقت یہی تو ہے کہ کم از کم دو فریق اپنے متعین سرمائے اس عقد میں متفق علیہ مدت تک کے لئے مخصوص کرلیں اور ان کی بنیاد پر (اور ضرورت ہو تو عمل کی وجہ سے بھی) اپنے لئے نفع کی شرح طے کریں۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کے دور میں یومیہ بنیاد (Basis of daily products) کا تو وجود نہیں تھا لہٰذا کیسے سوچا جاسکتا ہے کہ ان کے دور میں دو آدمی آپس میں مشارکہ کا عقد تو کریں لیکن عقد کے وقت نہ تو ان کو سرمایہ کی مقدار کا کچھ اندازہ ہو اور نہ ہی نفع کی کوئی شرح طے کریں۔ غرض علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی عبارت کو عمران اشرف صاحب اپنے

حق میں لائیں یہ کسی طرح درست نہیں ہے۔

یومیہ بنیاد (Basis of daily products) پر عمران اشرف صاحب نے خود ہی ایک اور اعتراض نقل کیا ہے جو یہ ہے:

"Some contemporary scholars do not allow this method of calculating profits on the ground that it is just a conjectural method which does not reflect the actual profits really earned by a partner of the musharakah. Because the business may have earned huge profits during a period when a particular investor had no money invested in the business at all or had a very insignificant amount investsd, still, he will be treated at par with other investors who had huge amounts invested in the business during that period. Conversely, the business may have suffered a great loss during a period when a particular investor had huge amounts invested in it. Still, he will pass on some of his loss to other investors

who had no investment in that period or their size of investment was insignificant.

''چند ہم عصر علماء نفع کی تعیین کے اس طریقے کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے خیال میں یہ ایک محض تخمینی طریقہ ہے جس سے مشارکہ میں کسی شریک کا کمایا ہوا حقیقی نفع معلوم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کاروبار میں بہت زیادہ نفع ان دنوں میں ہوا ہو جب ایک شریک کا سرے سے یا تو سرمایہ ہی موجود نہ ہو یا ہو تو اتنا تھوڑا کہ قابل ذکر ہی نہ ہو۔ اس کے باوجود اس کو ان دوسرے شرکاء کے برابر سمجھا جائے گا جنہوں نے اس مدت میں بہت بڑی مقدار میں سرمایہ لگایا ہو۔ اس کے برعکس صورت میں یہ ممکن ہے کہ کاروبار کا اس مدت میں بہت زیادہ نقصان ہوا ہو جب ایک شریک کا بہت زیادہ سرمایہ لگا ہو۔ اس کے باوجود اس کا کچھ نقصان ان دیگر شرکاء کو منتقل کر دیا جائے گا جن کا اس مدت میں کچھ بھی سرمایہ نہ ہو یا ہو تو بہت تھوڑا جو نا قابل ذکر ہو۔''

ہم کہتے ہیں

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اس طریقے سے کسی شریک کے واقعی نفع کی صحیح مقدار معلوم نہیں ہوتی کیونکہ فرض کریں مشارکہ کی کل مدت ایک سو دن ہے۔ مدت کے شروع ہی میں عمر نے پانچ ہزار اور بکر نے دس ہزار جمع کرائے۔ اور پوری مدت میں کچھ رقم نہ نکلوائی۔ ان کے مقابلہ میں زید نے شروع میں پانچ ہزار جمع کرائے اور دس دن بعد وہ نکلوا لئے۔ آخر کے دس دنوں میں پانچ ہزار روپے پھر جمع کرا دیئے۔

ان سو دنوں کا سرمایہ ہوا............سولہ لاکھ

یعنی عمر کے 5000 روپے x100 دن =5,00,000 (5 لاکھ)

اور بکر کے 10,000 روپے x100 دن =10,00,000 (10 لاکھ)

اور زید کے 5,000 روپے x20 دن =100,000 (1 لاکھ)

100 دن میں کل 16 لاکھ روپے استعمال میں رہے تو ایک دن میں 16 ہزار روپے استعمال میں رہے۔ اگر کل نفع 8000 روپے ہو تو یومیہ بنیاد کے حساب سے عمر کا نفع ہوا 2500 روپے اور بکر کا ہوا 5000 روپے اور زید کا ہوا 500 روپے۔ اب یہ ممکن ہے کہ 8000 روپے کا نفع درمیان کے انہی دنوں میں ہوا ہو اور شروع و آخر کے دس دس دنوں میں کچھ بھی نفع نہ ہوا ہو۔ زید کو بلا وجہ دوسروں کے سرمایوں پر ہونے والے نفع میں سے 500 روپے مل گئے۔ ایسے ہی نقصان کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

عمران اشرف صاحب اس اعتراض کا جواب یوں دیتے ہیں:

"This argument can be refuted on the ground that it is not necessary in a musharakah that a partner should earn profit on his own money only. Once a musharakah pool comes into existence all the participants, regardless of whether their money is or is not utilized in a particular transaction earn the profits accruing to the joint pool. This is particulary true of the hanafi school, which does not deem it necessary for a

valid musharakah that the monetary contribution of the partners are mixed up together. (Meezan Banks' guide:p178)

''ان علماء کی دی ہوئی دلیل کو اس بنیاد پر رد کیا جا سکتا ہے کہ مشارکہ میں یہ تو ضروری ہے ہی نہیں کہ شریک صرف اپنے سرمایہ پر نفع کمائے۔ جب ایک دفعہ مشارکہ طے ہو جاتا ہے تو تمام ہی شرکاء اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ کسی خاص عقد میں ان کا سرمایہ استعمال ہوا ہے یا نہیں مشارکہ سے حاصل ہونے والے نفع میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر حنفیہ کے نزدیک زیادہ مؤثر ہے کیونکہ ان کے یہاں مشارکہ کے جواز کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ تمام شرکاء کے سرمایوں کو مخلوط کر دیا جائے۔''

ہم کہتے ہیں

عمران اشرف صاحب کے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ مشارکہ میں یہ ضروری نہیں کہ ہر شریک صرف اپنے سرمایہ پر نفع حاصل کرے۔ شراکت کے بعد اگرچہ صرف ایک شریک کا سرمایہ استعمال ہوا ہو لیکن نفع میں دیگر شرکاء بھی شریک ہوتے ہیں۔

عمران اشرف صاحب نے مشارکہ کا ضابطہ تو بتایا لیکن وہ اس کا تجزیہ نہیں کر پائے کہ زید نے جب دس دن کے بعد اپنی رقم نکلوالی تو آیا شریعت کی نظر میں شراکت باقی بھی رہی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے تو شراکت ہی ختم ہو جاتی ہے خصوصاً جب کہ Sleeping partner (غیر عامل شریک) ہو اور وہ اپنا کل سرمایہ

Active partner (عامل شریک) سے واپس لے لے۔ اگر کل سرمایہ واپس نہ لے نصف واپس نکلوا لے تب بھی سابقہ شراکت تو باطل ہوگئی کیونکہ سرمایوں کے نئے تناسب (ratio) سے نئے عقد کی ضرورت ہوگی۔

غرض عمران اشرف صاحب کے تمام دلائل بے بنیاد ہیں۔ البتہ آخر میں وہ ایک اور دلیل دیتے ہیں جو آدمی کو غور کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ یہ کہ یہ ایک جدید صورت ہے اور حدیث اَلْمُسْلِمُوْنَ عِنْدَ شُرُوْطِهِمْ کے تحت مسلمان اگر اس پر اتفاق کر لیں تو جب کہ کسی حرام کی تحلیل اور حلال کی تحریم لازم نہیں آتی اس کے اختیار سے کوئی مانع نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"In the proposed system, all the partners are treated at par. The profit of each partner is calculated on the basis of the period for joint pool. There is no doubt that the aggregate profits accrued to the pool is generated by the joint utillization of different amounts contributed by the participants at different times. Therefore, if all of them agree with mutual consent to distribute the profits on daily products basis, there is no injunction of shariah which makes it impermissible, rather it is covered under the general

guidelines given by the Holy Prophet ﷺ in his famous hadith,as follows: "Muslims are bound by their mutual agreements unless they hold a permissible thing as prohibitedor a prohibited thing as permissible."

”مجوزہ نظام میں تمام شرکاء سے یکساں معاملہ کیا جاتا ہے۔ ہر شریک کا نفع اس مدت کی بنیاد پر لگایا جاتا ہے جس میں اس کا سرمایہ مشترکہ کھاتہ میں جمع رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشارکہ میں کل نفع مختلف اوقات میں جمع کرائی گئی مختلف رقموں کے استعمال سے حاصل ہوا ہے۔ اس لئے اگر سب کی اس پر باہمی رضامندی ہو کہ وہ یومیہ سرمایہ کی بنیاد پر آپس میں نفع تقسیم کریں گے تو شریعت کی کوئی نص ایسی نہیں ہے جو اس کو ناجائز قرار دیتی ہو بلکہ یہ تو نبی ﷺ کی ایک مشہور حدیث کہ مسلمان اپنی طے کی ہوئی شرطوں کے پابند ہیں جب تک وہ کسی حلال چیز کو حرام نہ کرلیں اور کسی حرام چیز کو حلال نہ کرلیں سے ثابت شدہ ضابطہ کے تحت داخل ہے۔“

لیکن ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ اس نظام کے تحت کسی اور کا حاصل کیا ہوا نفع دوسرے کو دے دیا جاتا ہے اور کسی اور کو ہونے والے نقصان کا کچھ حصہ دوسرے کے سر بھی ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ بات یقیناً جائز نہیں ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ صورت کو حدیث **اَلْمُسْلِمُوْنَ عِنْدَ شُرُوْطِهِم** کا مصداق سمجھنا درست نہیں ہے۔

آخر میں عمران اشرف صاحب نہ جانے کیوں بینکوں اور بینکاروں سے مرعوب

ہو کر لکھتے ہیں:

"If distribution on daily products basis is not accepted, it will mean that no partner can draw any amount nor can he inject new amounts to the joint pool. Similarly, no body will be able to subscribe to the joint pool except at the paticular dates of the commencement of a new term. This arrangement is totally impracticable on the deposit side of the banks and financial institutions where the accounts are debited and credited by the depositors many times a day. The rejection of the concept of the daily products will compel them to wait for months before they deposit their surplus money in a profitable account. This will hinder the utilization of savings for development of industry and trade, and will keep the wheel of financial activities jammed for long periods. There is no

other solution for this problem except to apply the method of daily products for the calculation of profits, and since there is no specific injunction of Shariah against it, there is no reason why this method should not be adopted."

''اگر یومیہ سرمایہ کی بنیاد پر نفع کی تقسیم کو قبول نہ کیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ نہ تو کوئی شریک کوئی رقم نکلوا سکتا ہے اور نہ ہی مشترکہ فنڈ میں کوئی نئی رقم شامل کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کسی کے لئے بھی ممکن نہ ہو گا کہ وہ مشترکہ فنڈ میں رقم جمع کرا سکے سوائے نئی میعاد کے شروع ہونے کی مقررہ تاریخوں میں۔ بینکوں اور مالیاتی اداروں میں بچت جمع کرانے کے اعتبار سے یہ طریقہ سرے سے ناقابل عمل ہے جہاں بچت کنندگان ایک دن میں کئی کئی بار پیسے جمع کراتے ہیں اور نکلواتے ہیں۔ یومیہ سرمایہ کے تصور کو رد کر دینے سے بچت کنندگان مجبور ہوں گے کہ کسی نفع بخش کھاتہ میں فاضل سرمایہ جمع کرانے سے پہلے وہ مہینوں انتظار کریں۔ یہ بات صنعت وتجارت کی ترقی کے لئے بچتوں کے استعمال سے مانع ہو گی اور اس طرح سے مالیاتی جدوجہد کے پہیئے طویل مدتوں کے لئے بالکل جام ہو کر رہ جائیں گے۔ اس مسئلہ کا اس کے علاوہ کوئی اور حل نہیں ہے کہ نفع کو معلوم کرنے کے لئے یومیہ سرمایہ کے طریقہ کو اختیار کیا جائے اور چونکہ اس کے خلاف شریعت کی کوئی نص موجود نہیں ہے لہٰذا اس کو اختیار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

اوپر یہ دکھانے کے بعد کہ یومیہ بنیادوں کا نظام واضح طور پر شریعت کے خلاف ہے ہمیں عمران اشرف صاحب کی اس انوکھی تقریر پر کچھ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ ''یہ کسی عام بینکر کی زبان کے الفاظ تو ہو سکتے ہیں ایک عالم دین اور اسلامی بینکر کے نہیں۔''

5- شیئرز کی خرید وفروخت

پیچھے اپنے مضمون میں شیئرز کی خرید وفروخت کے بارے میں ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں کہ وہ ناجائز ہے لیکن مولوی عمران اشرف صاحب مرابحہ کے تحت کمپنیوں کے حصص (Shares) کی خرید وفروخت کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"The shares of a lawful company can be sold or purchased on Murabahah basis because according to the principles of Islam, the shares represent ownership into assets of the company provided all other basic conditions of the transaction are fulfilled." (page 130)

''مرابحہ کی بنیاد پر کسی باقاعدہ کمپنی کے حصص خریدے اور فروخت کئے جا سکتے ہیں کیونکہ اسلامی اصولوں کی رو سے جب کہ عقد کی دیگر تمام بنیادی شرائط پوری کی جا رہی ہوں یہ حصص کمپنی کے اثاثہ جات میں ملکیت کی دلیل ہیں۔''

"In an equity or mutual fund (unit

trust) the amounts are invested in the shares of joint stock companies. The profits are mainly derived through the capital gains by purchasing the shares and selling them when their prices are increased. Profits are also earned through dividends distributed by the relevant companies." (P,210)

"کسی ایکوئیٹی یا مشترکہ فنڈ سے جائنٹ سٹاک کمپنیوں کے حصص میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ عام طور سے انہی حصص کو خرید کر اور جب ان کی قیمت میں اضافہ ہو جائے تو ان کو فروخت کر کے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کمپنیاں جو نفع دیتی ہیں وہ بھی حاصل ہوتا ہے۔"

6-اسلامی بینک کا اپنے وکیلوں اور نمائندوں پر اندھا اعتماد

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں غلط بیانی کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ جعلی رسیدیں اور واؤچرز بنانا عام معمول کا حصہ ہے۔ ان حالات میں ایک اہم اور انقلابی نظام کو ایسے لوگوں کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے تو اس نظام کی شکل کے بننے سے پہلے ہی بگڑنے کا قوی اندیشہ ہے جو قریب قریب یقین کے ہے۔ بلکہ موجودہ حالات میں تو بینک کے نمائندے کی تصدیق پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی بھی شخص کی جیب میں پانچ سو یا ہزار کا نوٹ ڈالا جائے تو وہ دستخط کیوں نہ کرے یا کب تک نہ کرے؟ میزان بنک اور البرکہ بینک اور دیگر اسلامی بینکوں میں جس قسم کا عملہ موجود ہے وہ City

Bank (سٹی بینک) یا Hong Kong Bank (ہانگ کانگ بینک) سے مختلف نہیں ہے۔اس کی وضع قطع اور اس کی ہیئت سے ایسا کوئی تاثر نہیں ملتا کہ وہ کوئی مشنری(Missionary) جذبہ رکھتا ہے جب کہ انقلابی قسم کے کاموں کی کامیابی کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو انقلابی ذہن اور مشنری جذبہ رکھتے ہوں۔محض Professionals سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی۔اور اگر بالفرض تصدیق کنندہ دیانتدار بھی ہو تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ عمیل نے سابقہ پڑا ہوا مال نہ دکھا دیا ہو یا کسی سے وقتی عاریت کے تحت لے کر نہ دکھا دیا ہو۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے دارالعلوم میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نے مرابحہ مؤجلہ کے ذریعہ سرمایہ کاری کے تحت یہ تجویز دی۔

''مثلاً ایک کاشتکار بینک سے ٹریکٹر کی خریداری کے لئے قرض لینا چاہتا ہے تو بینک اس کو قرض دینے کے بجائے خود ٹریکٹر خرید کر بصورت مرابحہ مؤجلہ فروخت کر دے گا۔

بینک کے لئے از خود تمام مطلوبہ اشیاء کی خریداری براہ راست مشکل ہے اس لئے وہ مطلوبہ اشیاء کی خریداری کے لئے خود عمیل کو اپنا وکیل بنا دے گا اور یہ عمیل پہلے وہ چیز مثلاً ٹریکٹر بینک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر قبضہ میں لے لے گا اور خریداری کی تکمیل پر بینک کو مطلع کر دے گا کہ میں نے وکالت کی بنیاد پر آپ کے لئے ٹریکٹر خرید کر اپنے قبضہ میں لے لیا ہے اور اب میں وہ ٹریکٹر آپ سے اپنے لئے خریدنا چاہتا ہوں''۔(احسن الفتاویٰ ج7 ص119)

مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے اس پر حاشیہ لکھا:

''مجلس نے یہاں یہ اضافہ بھی کیا تھا جو غالباً سہواً تحریر سے رہ گیا

ہے۔ بینک عمیل کے قبضہ کی تصدیق کے لئے اپنا کوئی نمائندہ بھیجے گا جو قبضہ ثابت ہونے پر اس کا سرٹیفکیٹ دے گا‘‘۔ (احسن الفتاویٰ ج 7 ص 119)

لیکن اسلامی بینک ایسے کسی تحفظ کا تکلف اٹھانے کو تیار نہیں اور وہ اپنے عمیل کو کھلا موقع دیتا ہے۔ خود عمران اشرف عثمانی صاحب اپنی کتاب میں اس تحفظ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"An agency agreement is signed by both parties in which the institution appoints the client as his agent for purchasing the commodity on its behalf.

The client purchases the commmodity on behalf of the institution and takes possession as the agent of the institution. The client informs the institution that he has purchased the commodity and simultaneously makes an offer to purchase it from the institution." (Islamic Banking:p.127)

’’دو پارٹیاں (یعنی بینک اور عمیل) ایک وکالت نامہ پر دستخط کریں گے جس کے تحت بینک عمیل کو بینک کے لئے سودا خریدنے کی خاطر اپنا وکیل مقرر کرتا ہے۔ عمیل بینک کے لئے وہ سامان خریدتا ہے اور بینک

کے وکیل کے طور پر اس سامان پر قبضہ کرتا ہے۔ پھر عمیل بینک کو اطلاع دیتا ہے کہ اس نے سامان خرید لیا ہے اور ساتھ ہی بینک سے اس کو خریدنے کی پیش کش بھی کرتا ہے۔''

مذکورہ بالا قوی خطرات کے ہوتے ہوئے موجودہ حالات میں اسلامی بینک کی اس عملی شق پر ظاہر ہے کہ اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔

7- ہنڈی (Bill of Exchange) پر قرض کی شرط

عمران اشرف صاحب لکھتے ہیں:

"The exporter with the bill of exchange can appoint the bank as his agent to collect receivable on his behalf. The bank can charge a fee for this service and can pvovide interest free loan to the exporter which is equal to the amount of the bill, and the exporter will give his consent to the bank that it can keep the amount received from the bill as a payment of the loan.

Here two processes are separated and thus two agreements will be made. One will authorize the bank to collect the

loan on his behalf as an agent for which he will charge a particular fee. The second agreement will provide interest free loan to the exporter, and authorize the bank for keeping the amount received through bill as a payment for loan.

These agreements are correct and allowed according to Shariah because collecting fee for service and giving interest free loan is permissible." (Meezan Banks' guide: pp 198/199)

''برآمد کنندہ جس کے پاس ہنڈی ہے وہ بینک کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے رقم وصول کرے۔ اس کام کے لئے بینک اجرت وصول کرسکتا ہے اور ساتھ ہی برآمد کنندہ کو اتنی رقم کا غیر سودی قرضہ جاری کرسکتا ہے جو ہنڈی کی رقم کے برابر ہو، نیز برآمد کنندہ بینک کو اپنی یہ رضا مندی دے سکتا ہے کہ وہ ہنڈی کی رقم وصول ہونے پر اس کو قرض کی واپسی میں شمار کرلے۔

یہاں دو جدا جدا عمل ہیں لہٰذا معاہدے بھی دو ہوں گے۔ ایک معاہدے کے تحت بینک کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ہنڈی کی رقم برآمد کنندہ کے لئے وصول کرے اور اس پر مخصوص اجرت لے۔ دوسرے معاہدے کے تحت بینک برآمد کنندہ کو غیر سودی قرضہ مہیا کرے گا نیز

بینک کو اختیار ہوگا کہ وہ ہنڈی کی رقم اپنے قرض کی واپسی میں رکھ لے۔
یہ معاہدے شریعت کی رو سے درست اور جائز ہیں کیونکہ کسی خدمت پر اجرت لینا بھی جائز ہے اور غیر سودی قرضہ دینا بھی جائز ہے۔''

ہم کہتے ہیں:

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ہنڈی یعنی Bill of Exchange کو مثلاً برآمد کنندہ بینک کے پاس لے جائے جو رقم کی وصولی کے لئے برآمد کنندہ سے اپنی فیس وصول کرے۔ البتہ بینک برآمد کنندہ کو علیحدہ سے بل کی رقم کے برابر غیر سودی قرضہ بھی دے۔ یہ دو معاملات علیحدہ علیحدہ کئے جائیں۔

یہ تدبیر بالکل غیر مناسب ہے کیونکہ ان دو معاملات کو علیحدہ علیحدہ کرنے کے باوجود ان میں وہ خرابی موجود رہتی ہے جو ان کے اکٹھے ہونے میں سمجھی گئی ہے۔ وہ اس طرح سے کہ بینک کی پالیسی کو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے جس پر اس کا مواخذہ ہوسکتا ہے لہٰذا برآمد کنندہ جب اپنے بل کی وصولی کے لئے فیس اور اجرت دے گا تو قانونی طور پر بینک سے قرضہ وصول کرسکتا ہے گویا قانونی اعتبار سے اجارہ قرضہ کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ یہ شرط اس طرح کی نہیں جس پر فریقین نے پہلے سمجھوتہ کرلیا ہو اور عقد میں اس کو ذکر نہ کیا ہو کیونکہ اس شرط کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوتی علاوہ ازیں المعروف کالمشروط کا قاعدہ بھی یہاں چلتا ہے۔ لہٰذا اجارہ فاسد ہوگا۔

8- بینک کا عملہ و ماحول

چھٹی خرابی بیان کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ: ''اسلامی بینک میں جس قسم کا عملہ موجود ہے وہ City Bank (سٹی بینک) یا Hong Kong Bank

(ہانگ کانگ بینک) سے مختلف نہیں۔اس کی وضع قطع اوراس کی ہیئت سے ایسا کوئی تاثرنہیں ملتا کہ وہ مشنری جذبہ رکھتا ہے جب کہ انقلابی قسم کے کاموں کی کامیابی کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو انقلابی ذہن اور مشنری جذبہ رکھتے ہوں۔ محض Professionals (پیشہ وروں) سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

دارالعلوم کے مولانا ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی صاحب اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک اہم بات جس کی شکایت بہت سے لوگوں کو کرتے دیکھا ہے یہ ہے کہ اسلامی بینکوں میں کام کرنے والے افراد کا لباس اور وضع قطع بھی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح کنوینشنل بینکوں میں کام کرنے والے افراد کی ہوتی ہے، اسی طرح کنوینشنل بینکوں کی طرح اسلامی بینکوں میں بے پردہ خواتین کام کرتی ہیں۔ بلاشبہ یہ دونوں پہلو توجہ طلب ہیں اوراسلامی بینکوں کو چاہئے کہ وہ اس سلسلہ میں ممکنہ جلدی کے ساتھ مثبت قدم اٹھائیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسلامی بینک کے ساتھ معاملہ کرنے والے ڈیپازیٹرز اور کلائنٹس مناسب طریقے سے ان پر دباؤ ڈالیں تو اس کے بہت مفید اثرات سامنے آسکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک مذکورہ تبدیلی عملی طور پرنہیں آجاتی اس وقت تک انہیں اسلامی بینک کہنا ہی جائز نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ انہیں اسلامی بینک کہنے کا مطلب صرف اور صرف اتنا ہے کہ ان میں ہونے والے مالی معاملات شرعی اصولوں سے متصادم نہیں۔

اس وقت پاکستان سمیت کتنے ہی اسلامی ملکوں میں اسلامی یونیورسٹیوں یا عام یونیورسٹیوں کے کلیہ معارف اسلامیہ میں پینٹ شرٹ

میں ملبوس افراد اور بے پردہ خواتین نظر آتی ہیں لیکن آج تک کسی مفتی صاحب کا ان یونیورسٹیوں کو غیر اسلامی یونیورسٹیاں یا ان کلیات کو غیر اسلامی کلیات قرار دینے کا فتوی احقر کی نظر سے نہیں گذرا۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان اداروں کو اسلامی کہنے کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ان میں اسلامیات سے متعلق نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ ان اداروں میں پڑھنے والے ہر فرد کی وضع قطع بھی شریعت کے مطابق ہے۔ اگر ان اداروں کو اسلامی کہنے کی گنجائش ہے تو ان بینکوں کو بھی اسلامی کہنا ناجائز نہیں''۔

(اسلامی بینکاری۔ ایک حقیقت پسند جائزہ ص 63)

ہم کہتے ہیں

ہمیں ان کو اسلامی بینک کا نام دینے پر بڑا اعتراض نہیں کیونکہ نام دینے میں کلی مناسبت کا ہونا ضروری نہیں بلکہ جزوی مناسبت بھی کافی ہوتی ہے البتہ صمدانی صاحب کے غور کے لئے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی اور کراچی کے دارالعلوم میں فرق کیا صرف اتنا ہے کہ اسلامی یونیورسٹی کے لڑکے پینٹ شرٹ پہنتے ہیں اور لڑکیاں بے پردہ رہتی ہیں اور دارالعلوم کے لڑکے کرتا شلوار پہنتے اور ٹوپی اوڑھتے ہیں؟ ظاہری وضع قطع تو ایک مظہر ہے جو دکھاتا ہے کہ دونوں اداروں کی اساسی فکر میں اور تعلیم و تربیت اور نصاب کے مزاج و نظام میں خاصا فرق ہے جس کی وجہ سے اسلامی یونیورسٹی کا کوئی طالب علم اپنی غیر اسلامی وضع قطع کے ساتھ دارالعلوم کے ماحول میں نہیں سما سکتا۔

انسان کی وضع قطع ہی عام طور سے اس کے رجحانات و میلانات کی نشاندہی کرتی

نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے تو یونیفارم پر زور دیا جاتا ہے اور یورپ اور ترکی میں عورتوں کا سکارف معرکۃ الآرا مسئلہ بنا ہوا ہے۔

اسی لیے جب کسی اسلامی بینک میں غیر اسلامی وضع قطع والے عملہ کو دیکھا جاتا ہے تو دیکھنے والا یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہاں اسلامی یونیورسٹی کا سا ماحول ہے۔ اور جیسے اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم وتربیت کا نظام ونصاب خالص اور کھرا اسلامی نہیں جیسا کہ دارالعلوم کا ہے اسی طرح اس اسلامی بینک کا بینکنگ نظام بھی خالص اور کھرا اسلامی نہیں ہوسکتا اس میں ضرور کچھ آمیزش ہے۔

غرض اسلامی بینکوں کے مالک اور ان کا عملہ جب غیر اسلامی وضع قطع کا حامل ہے تو عام سمجھ بوجھ والا آدمی بھی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ ان لوگوں نے اسلامی بینکنگ کو مشنری جذبہ سے نہیں لیا بلکہ ایک خالص پیشہ ور کی حیثیت سے لیا ہے جیسا کہ برطانیہ میں بھی غیر مسلموں نے اسلامی بینکنگ کو اختیار کیا ہے اور یہ اپنے مفادات کے تابع ہیں اور کوئی بعید نہیں کہ کسی بھی وقت یہ اپنے نظام میں من چاہی تبدیلی کر لیں۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو مروجہ اسلامی بینکنگ کو مشتبہ بنا دیتا ہے کہ آخر ان لوگوں نے کہ جو اپنے وجود پر اسلام نافذ کرنے کو تیار نہیں اسلامی بینکنگ کو کیوں اختیار کیا ہے اور ہماری جس حکومت نے غیر سودی بینکنگ کے حق میں فیصلہ دینے کی وجہ سے مولانا تقی عثمانی مدظلہ کو شرعی عدالت سے نکال دیا تھا اس کے وزیروں نے کچھ ہی مدت بعد اسلامی بینکنگ کی اذانیں کیسے دینی شروع کر دیں۔ اور امریکہ جو ہمارے ہاں کی نصاب کی کتابوں سے ان آیتوں کو نکلواتا ہے جن سے طلبہ کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتے تھے صرف ملکی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی پلیٹ فارم پر اتنے اہم اسلامی نظام کو کیسے برداشت کر رہا ہے۔

مسئلہ:6

کریڈٹ کارڈ کا شرعی حکم

کریڈٹ کارڈ کیا ہے؟

کریڈٹ کارڈ کسی بینک وغیرہ کی طرف سے جاری کردہ ایک دستاویز ہے جو اس کو کبھی فیس ادا کرنے سے اور کبھی فیس کے بغیر ملتی ہے۔اس کے ذریعہ سے بینک کارڈ ہولڈر (حامل کارڈ) کو دو قسم کی سہولتیں دینے کا عہد کرتا ہے۔

1- حامل کارڈ اگر خریداری کرے اور اپنا کریڈٹ کارڈ تاجر کو پیش کرے اور تاجر اس کو قبول کرے تو تاجر کو قیمت کی ادائیگی گاہک کے ذمہ نہ ہوگی بلکہ بینک اس کی ادائیگی کرے گا۔

2- ایک خاص رقم کی حد تک حامل کارڈ کو بینک کی طرف سے قرض کی سہولت ہوگی جو اگر مخصوص مدت کے اندر واپس کر دیا جائے تو بلا سود ہوگا اور اس مدت سے تجاوز کرنے پر سود دینا ہوگا۔

بینک اور حامل کارڈ کے درمیان معاملہ

بینک کبھی کارڈ کے اجراء کی فیس یا ممبر شپ فیس لے کر کارڈ جاری کرتا ہے اور ہر سال سالانہ فیس دے کر کارڈ کی تجدید کرائی جاتی ہے۔ یہ فیس سعودی عرب میں 500

ریال سے 1000 ریال تک ہوئی ہے۔(کریڈٹ کارڈ کے شرعی احکام محمد اسامہ ص 50)

بینک کبھی اس فیس کے بغیر بھی کارڈ جاری کر دیتا ہے۔فیس لینے کی صورت میں اس فیس کو محض کارڈ یا پلاسٹک کے ٹکڑے کی قیمت خیال کرنا یا قیمت قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ کارڈ تو اس بات کی علامت ہے کہ بینک نے حامل کارڈ کو اس فیس کے عوض مذکورہ بالا دو سہولتیں اور خدمات دینے کا عہد کیا ہے۔

بینک اور تاجر کے درمیان معاملہ

i- بینک تاجر کو ایک مشین مہیا کرتا ہے جس کے ذریعہ تاجر حامل کارڈ کا بیلنس چیک کرسکتا ہے اور کوئی ضرورت پڑنے پر بینک کو معاملہ سے مطلع کرسکتا ہے۔ بینک تاجر سے مشین کا کرایہ وصول کرتا ہے۔

ii- حامل کارڈ کی خریداری کا بل تاجر کارڈ جاری کرنے والے بینک کو ارسال کرتا ہے تاکہ اس کو ادائیگی کر دی جائے۔کارڈ جاری کرنے والا بینک بل میں موجود پوری رقم درج نہیں کرتا بلکہ اس میں 3 فیصد یا کم وبیش اپنا کمیشن کاٹتا ہے۔

کریڈٹ کارڈ میں خرابیاں

1- سود کا لین دین کرنا یا اس کی ذمہ داری لینا

کریڈٹ کارڈ کا مسئلہ محض چند ایک افراد کا نہیں ہے بلکہ پوری مسلمان اجتماعیت کا مسئلہ ہے۔ایسے ہی بہانوں سے مفسد لوگ مسلمانوں کو سود اور حرام میں مبتلا کرتے ہیں۔کریڈٹ کارڈ میں اس قسم کی خرابیاں یہ ہیں:

i- مخصوص مدت کے گزرنے پر سود کا لین دین کرنا جو قطعی حرام ہے۔

ii- حامل کارڈ کا سود کا معاملہ کرنا اور یہ ذمہ داری لینا کہ تاخیر ہونے پر وہ سود ادا کرے گا بذات خود گناہ کی بات ہے اور دینی غیرت کے خلاف ہے۔

جامعہ احتشامیہ کراچی کے مفتی محمد فاروق صاحب یہ کہہ کر سودی معاملہ کی قباحت کو کم کرتے ہیں کہ:

''حنفیہ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ عقود تبرع میں شرط فاسد خود فاسد اور لغو ہو جاتی اور عقد فاسد نہیں ہوتا البتہ اس میں شرط لگانے کا گناہ رہ جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اس کا مکمل اطمینان کر لے کہ اس شرط فاسد پر کبھی بھی عمل نہیں ہونا اور وہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کر دے اور سود کی ادائیگی کی نوبت نہ آنے دے تو ان شاء اللہ اس شرط فاسد کے لگانے کا گناہ بھی نہ ہوگا'' (کریڈٹ کارڈ کے شرعی احکام از محمد اسامہ ص 132)

ہم کہتے ہیں

خود مفتی محمد فاروق صاحب کے بقول عقد تبرع میں شرط فاسد کے لغو ہونے کے باوجود شرط فاسد کرنے کا گناہ ہوتا ہے تو محض یہ نیت و اطمینان کرنے سے کہ سود کی ادائیگی کی نوبت نہ آنے دے گا وہ گناہ کیوں نہ ہوگا۔ یہ اس وقت تو ممکن تھا جب کریڈٹ کارڈ لینے کی کوئی انتہائی مجبوری ہوتی لیکن جب ایسی کوئی مجبوری نہ ہو اور کریڈٹ کارڈ لینے والا محض اپنے مکمل اختیار سے صرف سہولتوں کی خاطر ایک سودی معاملہ پر دستخط کرتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ انشاء اللہ گناہ نہ ہوگا مفتی محمد فاروق صاحب کا تحکم ہے۔

2- مسلمان عوام کی اجتماعیت سے متعلق کوئی حکم لگانے سے پہلے عوام کی دینی حالت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور اس بات کو بھی کہ جس شے سے متعلق حکم دینا

ہے کیا وہ ناگزیر ہے یا نہیں اور یہ کہ اس شے کے پھیلانے والوں کے کیا مقاصد ہیں اور دنیا کو اس کا پہلے سے کچھ تجربہ ہے تو اس کے نتائج جواز اور عدم جواز میں سے کس کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ:

i- عام طور پر لوگ دینی احکام میں سست ہیں اور اس وجہ سے بہت سے لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی سود میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ii- جو لوگ محتاط ہیں ان کے پاس بھی کیا ضمانت ہے کہ وہ بروقت ادائیگی ضرور کر دیں گے۔کوئی بیماری، کوئی حادثہ اور کوئی چھٹی و ہڑتال ان کو سود کی ادائیگی پر مجبور کر سکتی ہے۔

2- بینک کا تاجر سے کمیشن لینا

بینک کا تاجر سے کمیشن لینا ناجائز ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بینک کارڈ کا اجراء فیس لے کر کرتا ہے۔ یہ فیس محض بے فائدہ کارڈ کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ کارڈ کی تجدید کیلئے سالانہ فیس اس پر واضح دلیل ہے۔ یہ فیس درحقیقت ان سہولتوں کا عوض ہے جو اوپر ذکر ہوئیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ حامل کارڈ جب کارڈ سے خریداری کرے گا تو تاجر کو قیمت کی ادائیگی بینک کرے گا۔ لہٰذا یہ وکالت بالا جر ہے اور بینک نے جس خدمت کا وعدہ کیا ہے اس کی فیس و اجرت وہ حامل کارڈ سے پہلے ہی لے چکا ہے۔اس خدمت کی تسلی وہ تاجر کو بھی دے چکا ہے اور اسی وجہ سے تاجر نے بینک سے مشین کرایہ پر لی ہے۔اب بینک جو وکیل بالا جر ہے یا جس نے تاجر کو اپنی طرف حوالہ کیا جانا قبول کیا ہے اس کو کوئی حق نہیں رہا کہ حامل کارڈ کا وکیل ہونے پر حوالہ کئے جانے والے تاجر سے فیصد کمیشن کے نام پر کچھ اجرت وصول کرے۔

اس کمیشن کے جواز پر کی گئی تاویلیں باطل ہیں جیسا کہ ذیل میں ہے:

i- بینک نے کریڈٹ کارڈ کی وجہ سے گاہک کو تاجر سے ملوایا ہے۔ یہ دلالی

(Brokerage) ہوئی اور بینک تاجر سے جو کمیشن کاٹتا ہے یہ اس کی دلالی کی اجرت ہوئی۔

یہ تاویل باطل ہے کیونکہ دلالی تو کوئی خاص سودا کرانے میں بائع ومشتری کے ملانے کو کہتے ہیں۔ بینک مختلف قسم کے دکانداروں کو مشین دیتے ہیں اوران کو کریڈٹ کارڈ قبول کرنے کا کہتے ہیں اور دوسری طرف گاہک کو کریڈٹ کارڈ لینے کا کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ بینک کا عمل دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کوئی مخصوص سودا کرانے میں دخیل ہوتا ہے، گاہک خود ہی بینک سے مشورہ کئے بغیر جس سے چاہتا ہے سودا خریدتا ہے۔

ii- تاجر نے بینک کو اپنا قرض وصول کرنے کو کہا ہے لہٰذا بینک تاجر کا وکیل بالاجرۃ بن کر قرض وصول کرتا ہے۔

یہ بات بھی درست نہیں ہے کیونکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ گاہک نے کریڈٹ کارڈ پیش کر کے گویا تاجر سے کہا ہے کہ وہ قیمت اس کی جانب سے بینک سے وصول کرلے۔تو تاجر نے جس بینک سے پیسے وصول کرنے ہیں یا دوسرے لفظوں میں تاجر قیمت کی وصولی کیلئے جس بینک کے حوالے کیا گیا ہے اسی کو اجرت بھی دے یہ ضابطہ کے خلاف بات ہے۔

iii- بینک نے اپنی جو خدمات گاہک کو فراہم کی ہیں ان کا معاوضہ وہ 3 فیصد کے حساب سے گاہک سے ہی وصول کرتا ہے اور وہ اس طرح سے کہ 100 روپے کے بل میں گویا 97 روپے شے کی قیمت ہوئی اور 3 روپے بینک کی خدمات کا معاوضہ ہوئے۔ یہ تاویل بھی مندرجہ ذیل وجوہ سے باطل ہے:

الف۔ تاجر 100 روپے کا بل خریدی ہوئی شے کا بل بنا کر دیتا ہے۔

ب۔ بینک خود اس کو تاجر کے نام پر کمیشن کہہ کر کاٹتا ہے۔

ج۔ گاہک یعنی حامل کارڈ سے بینک پہلے ہی فیس کے نام پر مہیا کی جانے والی

خدمات وسہولیات کا معاوضہ لے چکا ہے۔

iv- بینک نے تاجر کو اس ضمن میں جو خدمات فراہم کی ہیں یہ اس کی اجرت ہے۔

یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ خریدی ہوئی شے سو روپے کی ہو یا ہزار روپے کی بینک کی خدمت کی مقدار و شدت یکساں ہے تو پھر اس میں 3 روپے اور 30 روپے کا فرق نہ ہونا چاہئے۔

تنبیہ

جامعہ احتشامیہ کراچی کے مفتی محمد فاروق صاحب کی اس ضمن میں جامع اور زور دار وکالت ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اپنے فتوے میں لکھتے ہیں:

''بینک کا تاجر سے بھی کمیشن وصول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ اجرت صرف حوالہ قبول کرنے کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ ان جائز خدمات کے مقابلہ میں ہے جو بینک تاجر کو فراہم کرتا ہے مثلاً بینک تاجروں کو یہ خدمات مہیا کرتا ہے کہ وہ ان کو چیکنگ مشین فراہم کرتا ہے (حالانکہ بینک اس پر تاجر سے الگ کرایہ وصول کرتا ہے۔ عبدالواحد) اور ان کے لئے فوری جواب دینے کا انتظام کرتا ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ اچھے گاہکوں کو جو حاملین کارڈ ہیں ان کی طرف کھینچ کر لاتا ہے۔ پھر ان کے دیون (قرض) کو حاملین کارڈ سے وصول کرتا ہے۔ ان تمام کاموں میں محنت اور مشقت ہے تو یہ کمیشن دراصل ان خدمات اور محنت و مشقت کا ہے اس لئے اس کا لینا دینا جائز ہے۔''

ہم کہتے ہیں

ہمیں افسوس ہے کہ یہ عبارت کسی عالم ومفتی کی نہیں بلکہ ایک پختہ بینکر یا کریڈٹ کارڈ دلال کی معلوم ہوتی ہے۔

اگر کسی کو خیال ہو کہ قاعدے کی رو سے کارڈ کی فیس بھی شرعاً جائز نہیں ہونی چاہئے لیکن تم نے اس کو ناجائز شمار نہیں کیا حالانکہ اس کے عوض بینک جو خدمات مہیا کرتا ہے ان میں قرضہ کی فراہمی بھی ہے اب کوئی کسی کو قرض دے اور اس خدمت کے عوض میں اجرت وصول کرے خواہ قرض پر قبضہ دینے سے پہلے یا بعد میں تو اس اجرت کا سود ہونا واضح ہے اسی طرح کارڈ کے اجراء کی فیس سود پر مشتمل ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تو کریڈٹ کارڈ کی سکیم کی سرے سے مخالفت کرتے ہیں لہٰذا ہم اس فیس کو بھی کیوں جائز کہیں گے۔ یہ تو صرف فرض کرنے والی بات ہے کہ اس فیس کو مندرجہ ذیل وجوہ کی بنیاد پر صحیح فرض کرلیا جائے۔

i- یہ فیس محض قرض دینے کی سہولت کے عوض میں نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دیگر خدمات بھی ہیں مثلاً کارڈ جاری کرنا اور گاہک کے اکاؤنٹ میں سے تاجر کو قیمت منتقل کرنا۔

ii- حامل کارڈ کا قرض لینا کوئی ضروری نہیں ہے۔

تنبیہ

اگر بینک کارڈ کے اجراء پر کچھ بھی فیس نہ لیتا ہو تو کیا اس صورت میں بینک کو تاجر سے کمیشن یا کچھ عوض لینا درست ہے؟

اس صورتحال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ بینک اصلاً کس کے لئے کام کرتا ہے حامل کارڈ کے لئے یا تاجر کے لئے یا دونوں کے لئے۔ غور کیا جائے تو بینک اصل میں حامل کارڈ کے لئے کام کرتا ہے یعنی اس کا

وکیل ونمائندہ بن کر کام کرتا ہے تاجر کا وکیل نہیں ہوتا۔اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

1-اصل چیز کارڈ ہے کہ وہ ہوگا تو استعمال ہوگا اور تاجر اس کو قبول کرے گا۔

2- کارڈ کا اصل فائدہ حامل کارڈ کو ہوتا ہے کیونکہ اس کو قرض کی سہولت ملتی ہے۔اسی وجہ سے اس کارڈ کو کریڈٹ کارڈ یعنی قرضہ والا کارڈ کہا جاتا ہے۔علاوہ ازیں کارڈ ہولڈر جیب کٹنے، ڈاکہ زنی ہونے اور بے دھیانی سے روپیہ جیب سے گر جانے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس تاجر کو کارڈ قبول کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں بلکہ اس میں اس کے لئے مشقت ہے کہ وہ پہلے بینک کی مشین سے حامل کارڈ کا بیلنس چیک کرے پھر کوپن کو بھرے اور پھر کوپن کو اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائے اور پھر گاہک کو ڈسکاؤنٹ دے اور بینک کو کمیشن دے۔یہ تو بینک کی کاریگری ہے کہ وہ موہوم فائدے مثلاً گاہک زیادہ آئیں گے، بکری زیادہ ہوگی، اور رقم کی حفاظت رہے گی تاجر کو اصلی بنا کر دکھاتا ہے۔تاجر کو اصل خدشہ اس کا ہوتا ہے کہ کوئی گاہک جو سودا لینے کو تیار ہے لیکن حامل کارڈ ہے وہ کہیں واپس نہ چلا جائے۔اس خدشہ کو حقیقت بنتا دیکھ کر وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ بینک کی تمام شرائط کو مان لے۔

3- خریداری گاہک کرتا ہے۔اس کے ذمہ قیمت ادا کرنا آتا ہے۔بینک اس کا وکیل بنتا ہے اور گاہک کو اس مقصد سے کارڈ جاری کرتا ہے کہ تاجر گاہک کی طرف سے اس سے قیمت وصول کر سکتا ہے اگرچہ گاہک کے اکاؤنٹ میں کچھ بھی رقم نہ ہو۔غرض بینک گاہک کا وکیل بن جاتا ہے۔

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ بینک ہر حال میں گاہک یعنی حامل کارڈ کا وکیل ہوتا ہے خواہ وہ وکالت اجرت پر ہو یا بغیر اجرت کے ہو۔دوسرے لفظوں میں وہ حامل کارڈ کا وکیل ہوتا ہے خواہ اس نے حامل کارڈ سے فیس لی ہو یا نہ لی ہو۔اور جب وہ حامل کارڈ کا وکیل ہے تو اس کے لئے اپنی ذمہ داری پوری کرنے پر تاجر سے کچھ عوض یا

اجرت لینا قطعاً جائز نہیں ہے۔

کریڈٹ کارڈ کا شرعی حکم: خلاصہ

مذکورہ بالا خرابیوں کی وجہ سے کریڈٹ کارڈ کی سکیم بھی ناجائز ہے اور اس کو لینا بھی ناجائز ہے۔

تنبیہات

1- کریڈٹ کارڈ کا جائز متبادل ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) ہے جس کے ذریعہ حامل کارڈ صرف اپنے ہی جمع شدہ پیسوں سے خریداری کرسکتا ہے۔اس کارڈ پر اس کو قرض کی سہولت نہیں ملتی۔ اگر ڈیبٹ کارڈ سے خریداری پر بھی بینک تاجر سے کمیشن وصول کرتا ہے تو یہ ناجائز ہے۔

2- اگر کسی شخص کو کوئی خاص مجبوری ہو کہ کوئی ضروری ادائیگی کرنی ہو جو صرف کریڈٹ کارڈ سے ہوسکتی ہے اور اس میں ڈیبٹ کارڈ بھی نہ چلتا ہو تو بینک میں رقم جمع کرا کے کریڈٹ کارڈ لیں اور اس سے قرض کے بغیر اپنی ضرورت پوری کر کے کارڈ کو واپس کردیں یا ضائع کردیں۔

مسئلہ: 7

تجارتی انعامی سکیموں کا شرعی حکم

انعام کیا ہوتا ہے اور یہ کہاں جائز ہوتا ہے

انعام وہ ہوتا ہے جو کسی مطلوب وصف پر حوصلہ افزائی کے لئے دیا جاتا ہے۔ مثلاً امتحان میں اول ودوم وغیرہ آنے پر انعام دیا جاتا ہے تاکہ علم میں جس کا سیکھنا مطلوب وصف ہے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے یا گھڑ دوڑ میں جو اول ودوم آئے اس کو انعام دیا جاتا ہے کیونکہ گھڑ دوڑ میں جہاد کی تربیت ہے اور یہ تربیت حاصل کرنا وصف مطلوب ہے۔ پیدل دوڑ اور تیراکی وغیرہ بھی جہاد کی تربیت کی نیت سے ہوں تو یہ بھی مطلوب ہیں۔

ولا باس بالمسابقة فی الرمی و الفرس والبغل والحمار...... والابل و علی الاقدام لانه من اسباب الجهاد فكان مندوبا و عند الثلاثة لا يجوز فی الاقدام ای بالجعل اما بدونه فيباح فی كل الملاعب. (در مختار ص 285 ج 5)

تیراندازی میں، گھوڑے، گدھے، خچر اور اونٹ کی سواری میں اور پیدل دوڑ میں مقابلہ کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے کیونکہ یہ جہاد کے اسباب ہیں۔ لہٰذا ان میں مقابلہ مستحب ہے۔ دیگر تین ائمہ کے نزدیک پیدل دوڑ میں مقابلہ میں جب انعام ہو تو جائز

نہیں البتہ انعام کے بغیر سب میں مقابلہ جائز ہے۔

(قوله فيباح في كل الملاعب) اى التى تعلم الفروسة وتعين على الجهاد لان جواز الجعل فيما مرانما ثبت بالحديث على خلاف القياس فيجوز ماعداها بدون الجعل و فى القهستانى عن الملتقط من لعب بالصولجان يريد الفروسية يجوز و عن الجواهر قد جاء الاثر فى رخصة المصارعة لتحصيل القدرة على المقاتلة دون التلهى فانه مكروه. (رد المحتار ص 285 ج 5)

وہ تمام کھیل جو گھڑ سواری سکھاتے ہیں اور جہاد کے لئے تیار کرتے ہیں ان میں مقابلہ کرنا جائز ہے کیونکہ انعام کا جواز حدیث سے ثابت ہے اور خلاف قیاس ہے لہٰذا باقی مقابلوں میں انعام کی شرط کے بغیر جواز ہے۔ اور قہستانی میں ملتقط سے نقل ہے کہ جو گھڑ سواری میں مہارت حاصل کرنے کے ارادے سے صولجان کھیلے تو جائز ہے اور جواہر سے نقل ہے کہ کشتی کی رخصت کا ذکر حدیث میں ہے تا کہ دشمنوں سے لڑائی پر قادر ہو سکے۔ محض شوقیہ کھیل کے طور پر کشتی کرنا مکروہ ہے۔

حل الجعل و طاب...... ان شرط المال فى المسابقة من جانب واحد و حرم لوشرط فيها من الجانبين لانه يصير قمارا الا اذا أدخلا ثالثا محللا بينهما بفرس كفؤ لفرسيهما يتوهم ان يسبقهما والا لم يجز...... وكذا الحكم فى المتفقهة فاذا شرط لمن معه الصواب صح. (در مختار ص 285 ج 5) وان شرطاه لكل على صاحبه لا والمصارعة ليست ببدعة الا للتلهى فتكره...... و اما السباق بلا جعل فيجوز فى كل شى (اى مما يعلم الفروسية و يعين على الجهاد بلا قصد التلهى...... (درمختار و رد المحتار ص 286 ج 5)

انعام جائز ہے اور پاک ہے اگر مقابلہ میں مال کی شرط ایک جانب سے ہو۔ اور حرام ہے اگر شرط دونوں جانب سے ہو کیونکہ اس صورت میں یہ قمار اور جوا بنتا ہے مگر جب کہ دونوں اپنے گھوڑوں کے ساتھ ایک ایسے تیسرے گھوڑے کو بھی بطور محلل شریک کرلیں جو دوسرے دونوں گھوڑوں کے برابر کا ہو اور امکان ہو کہ وہ دوسرے دو سے آگے بڑھ جائے۔ اگر تیسرا گھوڑا ایسا نہ ہو تو پھر دوطرفہ انعام کی شرط جائز نہیں۔ اور یہی حکم اصحاب علم کے لئے ہے کہ اگر یہ شرط کی کہ جو درست جواب دے گا اس کو انعام ملے گا تو درست ہے۔

مذکورہ بالا ان عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسابقت یا تو علم میں مہارت حاصل کرنے میں جائز ہے یا صرف ان کاموں میں جائز ہے جن میں جہاد کی تربیت ہو اور وہ بھی جب کہ جہاد کی نیت سے ہو۔ اگر محض کھیل کود کے طور پر ہو تو اس وقت مسابقت اگرچہ بغیر انعام کے ہو مکروہ ہے۔ جہاد کی تربیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے لئے دوطرفہ انعام تک کو جائز رکھا مگر قمار سے نکالنے کے لئے اس میں محلل کو داخل کیا۔

تجارتی انعام کی تفصیل اور اس کا حکم

I- پہلی بات یہ ہے کہ زیادہ خریداری خواہ دکاندار کی ہو یا صارف کی، یہ کوئی وصف مطلوب نہیں ہے۔ اس میں نہ تو جہاد کی تربیت ہے نہ علمی مہارت کی تحصیل ہے اور نہ ہی کسی اور پسندیدہ خلق مثلاً خدمت خلق وغیرہ کی تحصیل ہے۔ لہٰذا اس میں مسابقت کی ترغیب دینا اصولی طور پر غلط بات ہے۔

II- دوسری بات یہ ہے کہ بائع جس کسی صورت میں بھی مبیع (فروخت کئے ہوئے سامان) میں اضافہ کرتا ہے خواہ وہ انعام کے نام سے ہی ہو وہ اضافہ اصل مبیع کا

حصہ قرار پاتا ہے اور مشتری قیمت میں جس نام سے بھی اضافہ کرے وہ اصل قیمت میں اضافہ شمار ہوتا ہے۔

وصح الزیادۃ فی المبیع ولزم البائع دفعھا ان فی غیر سلم زیلعی و قبل المشتری و تلتحق ایضا بالعقد. فلو ھلکت الزیادۃ سقط حصتھا من الثمن و کذا لو زاد فی الثمن عرضا فھلک قبل تسلیمہ انفسخ العقد بقدرہ. (درمختار ص 187 ج 4)

’’مبیع میں اضافہ کرنا صحیح ہے اور بائع پر لازم ہوگا کہ وہ اضافہ بھی خریدار کے سپرد کرے جب کہ بیع سلم نہ ہو اور مشتری اس اضافہ کو قبول کرلے۔ یہ اضافہ سودے کے ساتھ لاحق ہوگا۔ اس لیے اگر اضافہ ہلاک ہوجائے تو اس کے بقدر قیمت میں کمی ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر خریدار نے سامان کی شکل میں قیمت بڑھا دی پھر سپرد کیئے جانے سے پہلے وہ سامان ہلاک ہوگیا تو اس کے بقدر سودا کالعدم ہوجائے گا۔‘‘

بعض حضرات کا خیال

اس موقع پر عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ تجارتی انعامی سکیم کے تحت ملنے والا انعام مبیع میں اضافہ نہیں ہے بلکہ بائع کی جانب سے ہدیہ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ نئے ہدیہ (ہبہ مبتدأہ) کا یکطرفہ وعدہ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ ہدیہ کا وعدہ ہے جو خرید کے ساتھ مشروط ہے۔

ہم کہتے ہیں

ان حضرات کی یہ بات درست نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

1- فقہی ضابطہ ہے کہ **الامور بمقاصدھا** یعنی کاموں کا دارومدار ان کے

مقاصد پر ہوتا ہے۔ ہدیہ کا دنیوی مقصد یا تو عوض حاصل کرنا ہوتا ہے یا مدح حاصل کرنا یا محبت حاصل کرنا۔

وسببها ارادة الخير للواهب دنيوی کالعوض وحسن الثناء و المحبة من الموهوب له. (درمختار، البحر الرائق)

حدیث میں ہے تہادوا تحابوا یعنی آپس میں ہدیہ کا لین دین کرو تو باہم محبت کرو گے۔

انعامی سکیم میں ان میں سے کوئی بھی مقصد نہیں ہوتا لہٰذا یہ ہدیہ نہیں ہوتا۔ سکیم کے انعام سے مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو مزید خریداری میں رغبت ہو اور یہ ہدیہ کا مقصد نہیں ہے۔ ویسے بھی تجارتی رواج میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ خریدار کے لئے یا تو مبیع میں اضافہ کی پیشکش کی جائے یا قیمت میں کمی کر دی جائے۔ اس مسلمہ تجارتی طریقہ کار کو نظر انداز کرنا اور مبیع پر اضافہ کے بجائے اس کے انعام یا ہدیہ ہونے پر اصرار کرنا عجیب سی بات ہے۔

یہاں ہم دو اعتراض اور ان کے جواب ذکر کرتے ہیں۔

i- مقاصد حکم کی علت نہیں ہوتے بلکہ حکم پر مرتب ہونے والے اثرات ہوتے ہیں۔ ان کے نہ ہونے سے حکم معدوم نہیں ہوتا مثلاً روزے سے مقصود تقویٰ حاصل کرنا ہے۔ لیکن اگر کوئی روزہ رکھ کر بھی گناہ کرتا رہے تو یہ نہ کہیں گے کہ روزہ ہی نہ ہوا۔ اسی طرح جب بائع نے خریدار کو سودے کی بنیاد پر ہدیہ کیا اور اس پر ہدیہ کے مذکورہ مقاصد میں سے کوئی مرتب نہ ہو تو یہ نہ کہا جائے گا کہ ہدیہ ثابت نہ ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے

عبادات ہوں یا معاملات ان کی حقیقت وصورت کو متعین کرنے میں ان کے مقاصد بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ البتہ دونوں میں اتنا فرق ہے کہ عبادات کی حقیقت و

صورت شارع کی وضع کی ہوئی ہے اور خود ان کی صورت کو ادا کرنا شارع کی طرف سے وجوب یا ندب کے طور پر مطلوب ہوتا ہے۔ عبادات کے برعکس معاملات کی حقیقت وصورت نہ تو شارع کی وضع کی ہوئی ہے اور نہ ہی ان کی صورت کو ادا کرنا شارع کی جانب سے وجوب یا ندب کے طور پر مطلوب ہوتا ہے۔

اس فرق کی وجہ سے عبادات میں امتثال امر یعنی عبادت کی ظاہری صورت کو ادا کرنا بھی ایک مقصد شرعی ہے جب کہ معاملات میں نہ تو طلب و امر ہے اور نہ ہی امتثال امر کوئی مقصد شرعی ہے۔ اس لئے کوئی شخص روزہ رکھے اور گناہ کرتا رہے تو روزہ رکھنے کے امر کا امتثال اور روزے کے مقاصد میں سے ایک مقصد پایا گیا لہٰذا روزہ ادا شمار ہوگا۔ اس کے برخلاف خرید وفروخت کا اصل مقصد یہ ہے کہ خریدار کو اپنی ضرورت کا سامان ملے تاکہ وہ اس کو اپنی ضرورت میں خرچ کر سکے اور اسی طرح بائع کو قیمت مل جائے تاکہ وہ اس سے اپنی ضروریات کو حاصل کر سکے۔ ان مقاصد کی وجہ سے بیع کی یہ حقیقت طے ہوئی کہ وہ مال کا مال سے تبادلہ ہے۔ اگر بیع کے مقصد کا ایک حصہ یعنی بائع کا مال حاصل کرنا ساقط کر دیا جائے اور بائع کہے کہ تمہیں یہ شے بلا قیمت کے فروخت ہے تو اس کے باوجود کہ خرید وفروخت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں مقصد پورا نہ ہونے کی وجہ سے بیع کی حقیقت مفقود ہوگی۔ اسی طرح بائع کبھی قیمت کی وصولی کے بارے میں اطمینان چاہتا ہے کہ کوئی اور شخص بھی ذمہ داری قبول کرے۔ یہ مقصد کفالت کی حقیقت ضم ذمة الی ذمة کو متعین کرتا ہے یعنی مشتری کے ساتھ ایک اور شخص کی ضمانت۔ اگر مثلاً مشتری بائع کو قیمت کا ضامن دے اور کہے کہ یہ میرا کفیل اور ضامن ہے اور اب تم صرف اسی سے مطالبہ کرنا تو کفالت کا مقصد اور حقیقت فوت ہو جانے سے وہ معاملہ حوالہ کا بن جائے گا۔

اسی طرح ہدیہ کا دنیوی مقصد ہے محبت حاصل کرنا یا تعریف حاصل کرنا یا جواب

میں بلاعوض کوئی شے حاصل کرنا۔ یہ مقصد ہدیہ کی حقیقت **تملیک العین مجانا** کو متعین کرتا ہے یعنی دوسرے کو مفت میں کسی شے کا مالک بنانا۔ اگر کوئی بائع اپنے خریدار کو سودے کی بنیاد پر کوئی ہدیہ کرے تو چونکہ مذکورہ تین مقصدوں میں سے کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا اس لئے یہاں ہدیہ کی حقیقت مفقود ہو گی اور یہ کہ معاملہ درست رہے اس کو مبیع میں اضافہ پر محمول کرنا پڑے گا۔

ii- دوا کی کمپنی والے ڈاکٹروں کو کبھی قلم کبھی نسخہ لکھنے کی کاپی اور کبھی اسی طرح کی کوئی اور چھوٹی موٹی چیز ہدیہ کرتے ہیں۔ اس ہدیہ سے کمپنی والوں کا مقصد ڈاکٹر سے اپنی دوا لکھوانا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مقصد ہدیہ کے مذکورہ مقاصد میں سے نہیں ہے لہٰذا یہ ہدیہ نہیں ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ ہدیہ بھی رشوت کے زمرہ میں آنا چاہئے تھا کیونکہ یہ رشوت ہی ہوتی ہے جس سے ہدیہ کے مقاصد وابستہ نہیں ہوتے بلکہ اپنا جائز ناجائز کام نکلوانا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن پھر حقیر قیمت کی اشیاء سے نہ تو ڈاکٹر کمپنی کی دوا لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور نہ ہی کمپنی ڈاکٹر سے کوئی خاص توقع باندھتی ہے اور اس میں ابتلائے عام بھی ہے کہ دیگر تجارتی اداروں میں بھی ایسی چیزوں کا لین دین چلتا ہے اس لئے ان اشیاء کو رشوت کے زمرہ سے نکال کر ہدیہ کے مقصد مدح کے تحت داخل سمجھا جاتا ہے یعنی یہ کہ ان ہدیوں کے دینے پر ان کی تعریف کی جائے۔ لیکن بیش قیمت اشیاء جن کی وجہ سے وہ ڈاکٹر اس کمپنی کی دوا لکھنے پر عام طور سے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اور کمپنی بھی ان سے پوری توقعات رکھتی ہے وہ اشیاء رشوت ہی کے زمرے میں شامل رہیں گی۔

2- کسی سودے میں نیا ہدیہ (ہبہ مبتدءہ) اس وقت بنتا ہے جب اس کو مبیع میں شمار کرنا ممکن نہ ہو جیسا کہ امام زفر رحمہ اللہ کہتے ہیں۔

وقال زفر لا تجوز الزيادة مبيعا و ثمنا و لكن تكون هبة مبتدأة فان قبضها صارت ملكا له والا تبطل............ وجه قول زفر...... ان الثمن و المبيع من الاسماء الاضافية المتقا بلة فلا يتصور مبيع بلا ثمن ولا ثمن بلا مبيع فالقول بجواز الزيادة مبيعا وثمنا قول بوجود المبيع ولا ثمن والثمن ولا مبيع لان المبيع اسم لمال يقابل ملک المشتری و هو الثمن والثمن اسم لمال يقابل ملک البائع وهو المبيع فالزيادة من البائع لو صحت مبيعا لا تقابل ملک المشتری بل تقابل ملک نفسه لانه ملک جميع الثمن ولو صحت من المشتری ثمنا لا تقابل ملک البائع بل تقابل ملک المشتری لانه ملک جميع المبيع فلا تكون الزيادة مبيعا و ثمنا لانعدام حقيقة المبيع والثمن فيجعل منه هبة مبتدأة.

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اضافہ شدہ کو مبیع یا قیمت کہنا درست نہیں البتہ وہ نیا ہدیہ شمار ہوگا اور اس صورت میں ہدیہ کیا ہوا شخص اگر اس پر قبضہ کرلے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اگر اس پر قبضہ نہ کرے تو ہدیہ باطل ہو جائے گا............ امام زفر رحمہ اللہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ قیمت اور مبیع ان اسماء میں سے ہیں جو ایک دوسرے کی نسبت سے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں لہٰذا مبیع بغیر قیمت کے اور قیمت بغیر مبیع کے متصور نہیں ہے اور زائد کو مبیع یا قیمت کہہ کر جائز کہنا اس کے مرادف ہے کہ مبیع بغیر قیمت کے ہوسکتا ہے اور قیمت بغیر مبیع کے ہوسکتی ہے کیونکہ مبیع اس مال کو کہتے ہیں جو خریدار کی ملک یعنی قیمت کے مقابل ہو اور قیمت اس مال کو کہتے ہیں جو بائع کی ملک یعنی مبیع کے مقابل ہو۔ لہٰذا بائع کی طرف سے اضافہ کا اگر مبیع ہونا صحیح ہو تو وہ خریدار کی ملک کے مقابل نہیں بلکہ اپنی ملک کے مقابل ہوگا اس لئے کہ بائع اس

وقت پوری قیمت کا خود مالک ہے اور اگر خریدار کی طرف سے زائد کا قیمت ہونا صحیح ہو تو وہ بائع کی ملک کے مقابل نہیں بلکہ اپنی ملک کے مقابل ہوگا اس لئے کہ خریدار اس وقت کل مبیع کا خود مالک ہے۔ پس اضافہ شدہ مقدار مبیع اور قیمت نہ بنے گی کیونکہ مبیع اور قیمت کی حقیقت معدوم ہے اور اس کو نیا ہدیہ شمار کیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحہم اللہ اضافہ شدہ مقدار کو مبیع اور قیمت میں سے شمار کرتے ہیں اور اپنے دلائل دیتے ہیں جو بدائع الصنائع میں مذکور ہیں۔

امام زفر رحمہ اللہ کی بحث سے معلوم ہوا کہ اضافہ شدہ مقدار کو اولا مبیع یا قیمت میں سے ہی شمار کیا جائے گا۔ ہاں اگر وہ مبیع یا قیمت نہ بن سکے تو پھر اس کو ہدیہ پر محمول کیا جائے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اضافہ شدہ مقدار مبیع بن سکتی ہو لیکن پھر اس کے مقارن فساد کی وجہ سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہو تو اس وجہ سے اس کو ہدیہ نہ بنایا جائے گا کیونکہ اس کے مبیع بننے سے کوئی مانع نہیں ہے۔

3- ہدیہ کو شرط کے ساتھ معلق کرنا از روئے شریعت جائز نہیں ہے۔ شرح مجلّہ میں ہے۔

واما الذی لا یصح تعلیقه بالشرط شرعا فضابطه کل ما کان من التملیکات سواء کان مبادلة مال بمال من الطرفین او لا کالبیع والا جارة والا ستئجار والقسمة و الهبة والصدقة والنکاح (ص 234 ج 1)

وہ جس کو شرط کے ساتھ معلق کرنا از روئے شرع درست نہیں اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جو تملیکات ہیں خواہ ان میں دونوں طرف سے مال کا تبادلہ ہو یا نہ ہو مثلاً بیع، اجارہ پر دینا لینا، تقسیم ہدیہ، صدقہ اور نکاح۔

4- ہدیہ کے وعدے کو بھی شرط کے ساتھ معلق کرنا درست نہیں ہے۔ شرح مجلّہ میں ہے۔

واعلم انه ليس كل وعد يصح تعليقه، فالمراد الوعد الذى ورد جواز تعليقه شرعا. (ص 239 ج 1)

جان لو کہ ہر وعدے کی تعلیق درست نہیں۔ اس لئے یہاں صرف اس چیز کا وعدہ مراد ہے جس کی تعلیق کا جواز از روئے شرع وارد ہے۔

5- وہ ہدیہ یا وعدہ ہدیہ جو خریداری کے ساتھ مشروط ہو جب از روئے شریعت درست نہیں تو اس کی بنیاد پر انعامی سکیم بھی درست نہ ہوئی۔

لیکن اگر ہم اس کو مبیع میں اضافہ پر محمول کرلیں تو انعامی سکیم کی بنیاد بن سکتی ہے پھر انعام کی جو صورتیں آگے ذکر کردہ شرائط کے مطابق ہوں گی وہ صحیح ہوں گی اور جو ان کے مخالف ہوں گی وہ ناجائز ہوں گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں

جب معلق ہدیہ اور معلق وعدہ ہدیہ از روئے شریعت جائز نہیں تو انعامی سکیم کی طرف سے دیا ہوا انعام نیا ہدیہ یعنی ھبہ مبتدأہ شمار ہوگا نہ کہ مبیع میں اضافہ کیونکہ مبیع میں اضافہ کے لئے مبیع کا قائم ہونا شرط ہے جب کہ انعام ملنے کے وقت بسا اوقات مبیع موجود نہیں رہتا۔ نیز اگر مبیع میں اضافہ تسلیم بھی کیا جائے تو یہ اضافہ اسی وقت ہوگا جب انعام دیا جائے گا اور اس وقت وہ اضافہ معلوم اور متعین ہوتا ہے لہٰذا وہ مبیع کی عین شرائط کے مطابق ہوگا اور اس کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

ہم جواب میں کہتے ہیں

i- جیسا کہ اوپر ذکر ہوا نئے ہدیہ کا اس وقت اعتبار ہوتا ہے جب انعام کو مبیع بنانا ممکن نہ ہو۔ پہلے ہی مرحلہ میں اس کو ہبہ مبتدأہ کہنا ضابطہ کے خلاف ہے۔

ii- یہ بات کہ مبیع میں اضافہ کے لئے مبیع کا قائم ہونا شرط ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اضافہ میں ایجاب وقبول کے وقت مبیع قائم ہو، نہ کہ اس پر قبضہ کے وقت۔ مجلّہ میں

ہے۔

للبائع ان یزید مقدار المبیع بعد العقد (مادہ 254 مجلہ)

فی شرح العینی علی الهدایة ما نصه: زیادة البائع للمشتری فی المبیع جائز ما دام المبیع قائما لان المعقود علیه ما دام قائما کان العقد قائما لقیام اثرہ وهو الملک المستفاد فی العین. (شرح المجلہ ص 179 ج 2)

ہدایہ پر عینی رحمہ اللہ کی شرح میں ہے: بائع کا مشتری کے لئے مبیع میں اضافہ کرنا جائز ہے جب تک مبیع قائم ہو کیونکہ جب تک اصل مبیع قائم ہو عقد یعنی سودا بھی قائم سمجھا جاتا ہے اس کے اثر کے قائم ہونے کی وجہ سے جو مبیع میں حاصل ہونے والی ملکیت ہے۔

اس میں الفاظ **زیادة البائع للمشتری فی المبیع** یعنی بائع کا مشتری کے لئے مبیع میں اضافہ کرنا اس پر واضح دلیل ہیں کہ مراد اضافہ کرنا یعنی اس کا ایجاب کرنا ہے جو کہ بائع کا کام ہے اضافہ پر قبضہ کرنا نہیں ہے جو کہ مشتری کا کام ہے۔ اور انعامی سکیم میں انعام کا ایجاب عقد کے ساتھ ہی ہوتا ہے کیونکہ انعام خرید یعنی اصل عقد کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔

ii- انعامی بانڈ درحقیقت قرض کی رسید ہوتی ہے جو حکومت ان لوگوں کو جاری کرتی ہے جو حکومت کو قرض دیتے ہیں۔ حکومت انعامی بانڈ لینے والوں سے انعام کا وعدہ کرتی ہے۔ بانڈ لیتے وقت کوئی انعام یا ہدیہ نہیں ملتا۔ (اگر ملتا تو بہر حال وہ بھی سود ہوتا)۔ قرعہ اندازی میں نمبر نکلنے پر جب انعام ملتا ہے تو اہل حق میں سے کوئی بھی اس کو ہبہ مبتدأہ کہہ کر حلال نہیں بناتا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ انعام قرض دینے کے ساتھ مشروط ہوتا ہے یعنی اگر تم مجھے قرض دو تو تمہیں انعام و ہدیہ کا وعدہ ہے۔ لیکن ہدیہ کا وعدہ کسی

شرط کے ساتھ مشروط ہو وہ از روئے شرع درست نہیں ہوتا۔ پھر بھی جب حکومت قرعہ اندازی کر کے انعام دے اور لینے والا لے لے تو یہ سمجھا جائے گا کہ حکومت نے یوں کہا ہے کہ اگر تم مجھے قرض دو تو تمہیں قرض پر زائد یعنی سود دیا جائے گا اور لینے والے نے اسی کے تحت انعام یا سود لیا ہے۔

6- کچھ صورتیں جن میں ہدیہ مبیع میں اضافہ قرار پاتا ہے۔

i- خرید و فروخت مکمل ہونے کے کچھ دیر بعد بائع کہے کہ میں نے تمہیں کچھ مزید سامان عطا کیا یا ہدیہ کیا۔

لو اشترى عشرين بطيخة بعشرين قرشا ثم بعد العقد قال البائع اعطيتك خمسا اخرى ايضا فان قبل المشترى هذه الزيادة فى المجلس اخذ خمسة و عشرين بطيخة بعشرين قرشا. (مجلہ مادہ 254)

اگر بیس قرش میں بیس تربوز خریدے۔ پھر سودے کے بعد بائع نے خریدار سے کہا کہ میں نے تمہیں پانچ اور دئے۔ تو اگر مشتری نے اس اضافہ کو مجلس (اضافہ) میں قبول کیا تو وہ بیس قرش میں پچیس تربوز لے گا۔

ii- خرید و فروخت کے ساتھ ہدیہ مثلاً بائع یوں کہے میں نے یہ سامان تمہارے ہاتھ اتنی قیمت پر فروخت کیا اور تمہیں فلاں چیز ہدیہ ہے۔"

وجہ وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ۔

i- یہاں بائع کا مقصود ہدیہ دینا نہیں ہے۔

ii- سودے کے معاملہ میں مبیع میں اضافہ پر محمول کرنا ہدیہ پر محمول کرنے سے مقدم ہے۔

جب یہ بات واضح ہوئی کہ مزعومہ انعام کی صورت درحقیقت مبیع (سامان) یا ثمن (قیمت) میں کمی بیشی ہوتی ہے تو

اس میں مندرجہ ذیل شرطوں کالحاظ رکھنا ضروری ہے۔

1- انعام ایسی چیز ہو جو مبیع اور ثمن بن سکے۔

2- اس کے وجود میں خطر واندیشہ نہ ہو یعنی ایسی نہ ہو کہ نہ جانے ہو گی یا نہیں۔

3-اس کی مقدار میں جہالت یا تردد نہ ہو۔

اگر ایسی صورت پائی جائے کہ جس میں یہ تینوں شرطیں پائی جاتی ہوں تو وہ انعام صحیح ہو گا اور اگر کوئی ایسی صورت ہو جس میں پہلی یا دوسری یا تیسری شرط یا تینوں ہی مفقود ہوں تو انعام صحیح نہ ہو گا۔

انعام صحیح ہونے کی مثال

لپٹن چائے کی پیکنگ کے اندر بسکٹ کی ایک چھوٹی پیکنگ ملتی رہی ہے۔اسی طرح کسی ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ دانتوں کا برش رکھ دیا جائے یا کسی فریج ساتھ ٹوسٹر یا سینڈوچ میکر کر دیا جائے یا گھی کی مقدار میں 20 فیصد کا اضافہ دیا جائے تو صحیح ہے کیونکہ یہ اشیاء مبیع بھی بن سکتی ہیں اور ان کے وجود اور ان کی مقدار میں کسی قسم کی جہالت اور تردد نہیں ہے۔

انعام صحیح نہ ہونے کی مثالیں

1- پہلی شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی والا یہ طے کرے کہ جو ہم سے اتنی مالیت کا سامان خریدے گا ہم اس کو عمرہ کرائیں گے یا ہم اس کو ڈرائیور سمیت گاڑی فراہم کریں گے جس پر وہ مری کی سیر کے لئے جا سکتا ہے۔ان صورتوں میں کمپنی منافع مہیا کر رہی ہے جن پر اجارہ ہوتا ہے بیع نہیں ہوتی لہٰذا وہ مبیع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے

یہ انعام بھی درست نہیں ہے۔

2- دوسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دکانداروں سے یا کوئی بھی بائع اپنے خریداروں سے کہے کہ جو لوگ اتنا اتنا سامان خریدیں گے ہم ان کو کوپن دیں گے اور ان کے درمیان قرعہ اندازی کریں گے جس کے ذریعہ سے صرف ان خریداروں کو انعام ملے گا جن کے نام کا قرعہ نکلے گا۔ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ زید کے نام کا قرعہ نکلے اور ہوسکتا ہے کہ نہ نکلے۔

3- تیسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دکانداروں سے کہے کہ جو ہم سے اتنا سامان خریدیں گے ہم سب کو انعام دیں گے لیکن قرعہ اندازی سے خریداروں کو کم وبیش مالیتوں کے انعام دیں گے۔

4- تینوں شرطیں مفقود ہوں

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی اپنے خریداروں سے کہے کہ جو کوئی ہم سے اتنی اتنی خریداری کرے گا ہم اس کو کوپن دیں گے اور پھر قرعہ اندازی کریں گے۔ جس کے نام کا قرعہ نکلے گا اس کو ہم عمرہ کرائیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سعودیہ آنے جانے کا اور وہاں رہائش کا بندوبست کریں گے لیکن اس کو ٹکٹ نہیں دیں گے۔

III تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ انعام مشروط ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں شرط فاسد ہوتی ہے تو اس سے سودا بھی فاسد ہو جاتا ہے۔

1- جب کمپنی کے اعلان کے مطابق خریدار سامان خریدتے ہوئے یوں کہے کہ

میں اس شرط پر اتنا سامان خریدتا ہوں کہ آپ کو مجھے عمرہ کرانا ہوگا یا مری کی سیر کے لئے گاڑی فراہم کرنا ہوگی۔ چونکہ یہ شرط سودے کے تقاضے کے خلاف ہے اور اس میں خریدار کا فائدہ ہے۔ لہٰذا یہ شرط فاسد ہے اور اس کی وجہ سے سارا سودا ہی فاسد ہو جاتا ہے اور بائع اور خریدار دونوں گناہگار ہوتے ہیں اور دونوں پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس سودے کو ختم کریں اور اگر چاہیں تو اس شرط کے بغیر نئے سرے سے سودا کریں۔

2- انعامی سکیم یہ ہو کہ جو اتنا سودا خریدے گا اس کو کار کی قرعہ اندازی میں شریک کیا جائے گا۔ اب جو شخص اس انعامی سکیم کے مطابق سودا خریدتا ہے اور کوپن بھر کر دیتا ہے تو جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کار بھی مبیع کا حصہ بنے گی لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں کہ وہ ملے گی یا نہیں اس لئے مبیع کی مقدار بھی مجہول رہی۔ اس لئے اس میں قمار کے ساتھ بیع بھی فاسد ہوئی۔

تنبیہات

1- بعض اوقات کمپنی کے ملازم خریدار کو کہتے ہیں کہ اگر تمہیں اس انعامی سکیم میں کچھ تردد ہے تو ہم تمہاری طرف سے کوپن خود بھر دیتے ہیں اور اس کو قرعہ اندازی میں شامل کر دیتے ہیں۔

کمپنی کے ملازم کے اس طرح کرنے سے قباحت میں کچھ کمی نہیں آتی کیونکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم کوپن خود بھر دیتے ہیں تو وہ خریدار کے وکیل بن گئے اور وکیل کا تصرف مؤکل کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ ایک منکر ہے تو اس وقت ملازموں کے کہنے پر خاموشی درست نہیں بلکہ نہی کرنا واجب ہے۔

2- کمپنیوں والے جو اتنے بیش قیمت انعامات دکانداروں کو دیتے ہیں یہ

سرمایہ دارانہ نظام کا طریقہ ہے۔ مثلاً ڈاوٗلینس (Dawlance) کمپنی اپنے ڈیلرز کو اس طرح ترغیب دیتی ہے ''ہماری گزشتہ اسکیم'' 'جیت کا جوش 2' اور دیگر اسکیموں میں آپ تمام ڈیلرز نے بھر پور حصہ لے کر انہیں زبردست طریقے سے کامیاب بنایا...... اپنے اس رشتے کو آگے بڑھاتے ہوئے New Year (2008) کے پرمسرت موقع پر ہم ایک بار پھر لا رہے ہیں آپ کے لئے ایک MEGA لکی ڈرا اسکیم ''جیت کا جوش 3'' جس میں شامل ہیں ملک بھر میں کم از کم دو کروڑ روپے کے ہزاروں انعامات۔'' اصل ہمدردی تو صارف سے ہونی چاہئے کہ اس کو رعایت ملے ورنہ دکانداروں کو دیئے گئے انعامات کا بوجھ بھی بالآخر صارفین پر پڑے گا کیونکہ عام طور سے انعامات کو بھی اخراجات میں شمار کر کے اشیاء کی قیمت طے کی جاتی ہے۔ اس طرح سے یہ ''کَی لا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ'' یعنی تاکہ نہ آئے لینے دینے میں تمہارے دولتمندوں میں۔ (سورہ حشر: 7) کی مخالف صورت بنتی ہے۔

3- بعض اوقات کمپنی والے اپنی مصنوعات کی کسی ایک پیکنگ یا چند ایک پیکنگ میں انعامی پرچی رکھ دیتے ہیں تاکہ لوگ اس انعام کے لالچ میں زیادہ خریداری کریں۔ چونکہ وہ انعام کسی ایک کا یا چند ایک کا نکلنا ہے اس لئے ہر خریدار کے لئے اس انعام کے نکلنے کا وجود خطر و اندیشہ کا شکار ہے اور چونکہ جوئے کے معنی میں یہ بات شامل ہوتی ہے اس لئے جو خریدار اس موہوم انعام کے لالچ میں وہ سامان خریدتا ہے وہ ایک درجہ میں جوا کرتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اسی کی مثل ایک صورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مختلف قسم کی نمائشوں کے اندر داخلہ کا ٹکٹ ہوتا ہے اور نمائش کے منتظمین

یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص مثلاً دس روپے کا ٹکٹ یکمشت خریدے گا وہ اپنے اس ٹکٹ کے ذریعہ عام لوگوں کی طرح نمائش میں بھی داخل ہو سکے گا اور ان ٹکٹوں پر بذریعہ قرعہ اندازی کچھ انعام مقرر ہوتے ہیں جس کا نمبر نکل آئے اس کو وہ انعام بھی ملتا ہے۔

یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے کیونکہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے۔ لیکن اب مدار نیت پر رہ جاتا ہے جو شخص موہوم انعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہا ہے۔''
(جواہر الفقہ ج2 ص351)

ہم کہتے ہیں

اور جس خریدار نے اس موہوم انعام کے لالچ میں خریداری نہیں کہ بلکہ اپنی ضرورت سے کی اور کوئی کوپن بھی بھر کر نہیں دیا منتظمین نے خود ہی کوپن بھر دیا اور پھر اتفاق سے اس کا انعام نکل آیا تب بھی اس کے لئے مندرجہ ذیل وجوہ سے انعام کے لینے سے پرہیز کرنا ضروری ہے:

i- اس میں ایک غیر شرعی سکیم کے ساتھ تعاون ہے۔

ii- لوگ دلوں کی نیتوں کو نہیں جانتے وہ اس پر یہی تہمت رکھیں گے کہ اس نے غیر شرعی انعام لیا ہے۔

iii- اگر یہ خریدار دیندار ہو گا تو اور لوگ اپنی نیت و لالچ ہونے کے باوجود اس کے لینے کو اپنے لئے دلیل و حجت بنائیں گے۔